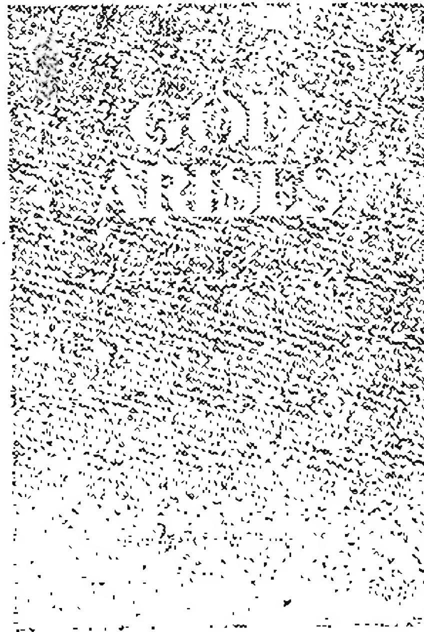
الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جہاں بریک لگانا ہو وہاں گاڑی کو تیز کرنا
منزل کی طرف سفر کرنے کے بجائے
قبرستان کی طرف اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے

جولائی ۱۹۸۸
شمارہ ۱۴۰



God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... *in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".*

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) Price Rs. 45
81-85063-17-6 (Hbd)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۰ جولائی ۱۹۸۸

فہرست

ماہانہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدّین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

مومنانہ مزاج

حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف تھا۔ حضرت عثمان حج کے دوران منیٰ میں رباعی (چار رکعت والی) نماز کو قصر کے بجائے مکمل پڑھتے تھے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ان میں قصر کرنے کے قائل تھے۔ حضرت عثمان نے بحیثیت خلیفہ حج کیا تو منیٰ میں رباعی نماز کو مکمل صورت میں پڑھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اس وقت مقتدیوں میں شامل تھے۔ انھوں نے قصر کے قائل ہونے کے باوجود خلیفہ ثالث کی اقتدا میں مکمل نماز ادا کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنے مسلک کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اختلاف کرنا برا ہے (الخِلَافُ شَرٌّ) اسی کے ساتھ انھوں نے ایک اور بات کہی جو مومن کی نفسیات کو نہایت عمدہ طور پر بتاتی ہے۔ انھوں نے کہا:

فَلَيْتَ حَظِّي مِن أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ رَكْعَتَانِ مُتَقَبَّلَتَانِ — کاش میرا حصہ یہ ہو کہ چار رکعت میں سے میری دو رکعت ہی قبول ہو جائے۔ (صحیح بخاری)

عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انھیں کسی انسان کی طرف سے معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اسی انسان کو نشانہ بنا کر اس سے زور آزمائی کرنے لگتے ہیں۔ جس سے معاملہ پیش آتا ہے اسی انسان سے وہ صحیح اور غلط کی لامتناہی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ مومن کا طریقہ اس سے جدا ہے۔

مومن اس کے برعکس یہ کرتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کو انسان کی طرف سے معاملہ پیش آتا ہے تب بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جس چیز کو لوگ انسانوں کے خانہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو وہ خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے، جہاں لوگ انسان کی نسبت سے کلام کرتے ہیں وہاں وہ خدا کی نسبت سے کلام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جن مواقع پر لوگ انسانوں کی طرف دوڑتے ہیں، وہاں وہ خدا کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ جن مواقع پر لوگ رکعتوں کی تعداد پر بحث کر رہے ہوتے ہیں، اس کا ذہن اس فکر میں ڈوب جاتا ہے کاش میری چند رکعتیں ہی قبول ہو جائیں۔

مومن کا مزاج ہر معاملہ میں خدا رخی ہوتا ہے اور غیر مومن کا مزاج انسان رخی۔

آسمانی معائنہ

ماسکو کے جنوب مغرب میں تقریباً ۸۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر روس کا ایک فوجی کارخانہ تھا۔ اس کا نام پاولوگراڈ پلانٹ (Pavlograd plant) تھا۔ اس کارخانہ میں بین براعظمی میزائل (انٹر کانٹنٹل بالسٹک میزائل) کے لیے انجن (Rocket Motors) بنائے جاتے تھے۔ نیوکلیر میزائل سے متعلق یہ کارخانہ روس میں اپنی نوعیت کا واحد کارخانہ تھا۔ وہ ایک خفیہ مقام پر واقع تھا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۸ کو کسی وجہ سے اس میں زبردست دھماکہ ہوا اور کارخانہ کا بڑا حصہ برباد ہو گیا۔

روسی ذرائع نے اس فوجی حادثہ کے بارہ میں دنیا کو کوئی اطلاع نہ دی۔ روس کے اخبارات اور روس کا ریڈیو اس معاملہ میں بالکل خاموش رہا۔ مگر اس کے بعد ہی اس واقعہ کی پوری خبر واشنگٹن (امریکہ) سے نشر کر دی گئی۔ روسی حادثہ کے بارے میں خود روس تو مکمل طور پر راز داری برتتے ہوئے تھا۔ مگر امریکہ کے ذریعہ اس کا علم پوری دنیا کو ہو گیا۔ بعد کو روسی ذرائع نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کا راز خلائی جاسوسی ہے جو موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۹ مئی ۱۹۸۸) نے واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ جو خبر شائع کی ہے اس کا ایک جملہ یہ ہے کہ امریکہ کے جاسوسی سیاروں نے اس دھماکہ کو ۱۲ مئی کی رات ہی کو معلوم کر لیا:

U.S. spy satellites detected the explosion
on the night of May 12.

یہ واقعہ گویا چھوٹے پیمانہ پر اس معاملہ کا مظاہرہ ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر اس دنیا میں قائم ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارہ کا "آسمانی معائنہ" خداوند عالم کے زیادہ وسیع اور زیادہ کامل آسمانی معائنہ کو بتا رہا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ آدمی اپنے اعمال کو خواہ کتنا ہی چھپائے، مگر خدا کی نگاہیں اس کو بالکل بے حجاب حالت میں دیکھ رہی ہیں۔ دنیا میں آدمی اپنی سرکشی کا اعتراف نہیں کرتا، مگر آخرت میں جب خدا انسان کے سامنے اس کا ریکارڈ رکھ دے گا تو انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ اس کا اعتراف کر لے۔

آدمی کو اگر اس آسمانی معائنہ کا احساس ہو تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

قرآن : ایک تاریخی معجزہ

قدیم یونان میں جو کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئیں، ان میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک الیڈ (Illiad) اور دوسرے اوڈیسی (Odyssey) الیڈ ایک مفروضہ جنگ کی کہانی بیان کرتی ہے اور اوڈیسی ایک مفروضہ سفر کی داستان ہے۔ لٹریری اہمیت کی بنا پر ان کتابوں کے ان گنت ترجمے کیے گیے ہیں۔ مگر دونوں کتابوں کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مصنف کا نام قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا مصنف ہومر (Homer) ہے جس کا زمانہ غالباً نویں صدی یا آٹھویں صدی قبل مسیح تھا۔ تاہم ہومر کے بارہ میں تاریخی معلومات تقریباً نہیں کے برابر ہیں :

Virtually nothing is known about the life of Homer (Vol. V, p. 103).

محققین نے اس مفروضہ پر بھی زبردست اعتراضات کیے ہیں کہ یہ کتابیں فی الواقع ہومر کی تصنیف ہیں۔ مثلاً سموئل ٹیلر (۱۹۰۲ - ۱۸۳۵) کا خیال ہے کہ اوڈیسی ایک عورت کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح الیڈ کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ کئی مرحلوں میں مختلف افراد کی کوششوں سے مرتب ہوئی (EB-8/1017) قدیم زمانہ کی کتابوں کا عام طور پر یہی حال ہے۔ ان کے بارے میں معلومات اتنی کم ہیں کہ ان کے ذریعہ ان کی کوئی واضح تاریخی تصویر نہیں بنتی۔

دور قدیم کی کتابوں میں قرآن واحد کتاب ہے جس کی ہر بات معلوم اور مسلّم ہے۔ جس کی واقعیت تاریخ کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ جو مکمل طور پر ایک تاریخی کتاب ہے —— قرآن کب اترنا شروع ہوا، ۶۱۰ء میں۔ کس کے اوپر اترا، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کے اوپر۔ وہ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں وفات پائی، ۵۷۱ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں مدینہ میں وفات پائی۔ قرآن کی زبان کیا تھی، عربی زبان۔ شروع میں قرآن کے کاتب کون لوگ تھے، ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، زید بن ثابت، عامر بن فہیرہ، ابوایوب انصاری، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن مسعود، وغیرہ۔

اسی طرح قرآن اور صاحب قرآن کے بارہ میں جو بھی تاریخی سوال کیا جائے، اس کا واضح جواب یقینی طور پر موجود ہوگا۔ جب کہ دور قدیم کی کسی دوسری کتاب کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔

ردو قبول کا معیار

ہر آدمی کے سامنے ردو قبول کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق کبھی وہ ایک چیز کو لیتا ہے، اور اسی کے مطابق وہ دوسری چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً ایک تاجر کا معیار تجارتی فائدہ ہے۔ وہ اس معاملہ کی طرف جھک جائے گا جس میں تجارتی فائدہ ہو، اور جس میں تجارتی فائدہ نظر نہ آئے، اس سے وہ دور ہو جائے گا۔ ایک وکیل کا معیار "کاغذ" ہے، اگر وہ دیکھے کہ اس کا کاغذ قانونی اعتبار سے پورا ہے تو وہ مطمئن رہے گا، اور اگر کاغذ قانونی اعتبار سے پورا نہ ہو تو وہ بے چین ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا معیار ان کا ذاتی وقار ہے۔ وہ ہر چیز کو اس معیار پر جانچتے ہیں کہ اس کا اثر ان کی ذات پر کیا پڑتا ہے۔ جو بات ان کے ذاتی وقار کو ٹھیس پہنچانے والی ہو، اس کو وہ رد کر دیں گے۔ اور جس بات سے ان کا ذاتی وقار محفوظ رہے اس کو اختیار کر لیں گے۔

ردو قبول کے یہ تمام معیار جاہلیت کے معیار ہیں۔ یہ ان لوگوں کے معیار ہیں جنھوں نے حقیقت کو نہیں جانا۔ جو ابھی تک اپنے ذہنی خول میں جی رہے ہیں۔ ان کے ذہنی خول سے باہر جو حقائق ہیں ان کی انھیں خبر نہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنے ذہنی خول سے باہر آجائے۔ جو تمام چیزوں کو حقیقتِ واقعہ کی نسبت سے دیکھنے لگے نہ کہ اپنے ذاتی رجحان کی نسبت سے۔

مومن کی زندگی کا معیار رجوع الی اللہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس نسبت سے جانچتا ہے کہ اس سے اس کے اندر اللہ کی طرف رجوع پیدا ہوا یا اللہ کی طرف رجوع پیدا نہیں ہوا۔ اس کی کامیابی اگر اس کے اندر شکرِ خداوندی کا جذبہ ابھارے تو وہ کامیابی ہے ورنہ ناکامی۔ اس کا نقصان اگر اس کو خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلائے تو وہ فائدہ ہے ورنہ سراسر نقصان ہے۔ غلطی کرکے اگر اس کے اندر اعترافِ خطا کا احساس ابھرے اور وہ اپنے رب کی طرف دوڑ پڑے تو ایسی غلطی اس سے بہتر ہے کہ وہ غلطی نہ کرے اور اس کے نتیجہ میں اس کے اندر جھوٹا پندار پیدا ہو جائے۔

کچھ لوگ نفسانی غذا پر جیتے ہیں اور کچھ لوگ ربانی غذا پر۔ غیر مومن کی خوراک نفسانی غذا ہوتی ہے۔ مومن وہ ہے جو ربانی غذا پر جینے لگے، جس کے لیے زندگی کا ہر تجربہ اس کو اپنے رب سے جوڑنے کا ذریعہ بن جائے۔

رازِ حیات

سمندر میں موجوں کے تھپیڑے ہیں۔ جو شخص سمندر میں اپنی کشتی چلانا چاہے وہ مجبور ہے کہ موج اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کشتی مطلوبہ منزل کی طرف لے جائے۔ جنگل میں جھاڑیاں اور درندے ہیں، جو جانور جنگل میں رہتے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں اور اپنے دشمن جانوروں کے درمیان اپنے لیے زندگی کا طریقہ نکالیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی سماج کا بھی ہے۔ انسانوں کے اندر بھی طرح طرح کے لوگ ہیں۔ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ مختلف اسباب سے ایک اور دوسرے کے بیچ میں ناخوش گواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اونچ نیچ اور یہ فرق سماجی زندگی میں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ کسی حال میں انھیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے زندگی اور کامیابی کا صرف ایک ہی ممکن راستہ ہے —— وہ "باوجود" کے اصول کو اپنی پالیسی بنائے۔ وہ مخالفتوں کے باوجود لوگوں کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ وہ ناخوش گواریوں کے باوجود اپنے لیے خوشگوار زندگی کا راز دریافت کرے۔ اس کے خلاف عداوتیں اور سازشیں کی جائیں تب بھی وہ اس یقین کے ساتھ آگے بڑھے کہ وہ اپنے مثبت عمل سے تمام منفی باتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو کانٹے کے باوجود پھول تک اپنا ہاتھ پہونچانا ہوتا ہے۔ یہاں بیماریوں کے بے شمار جراثیم کے باوجود اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند بنانا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو۔ اور نہ شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرے۔ وہ ان حقائق سے موافقت کرکے جیے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ وہ راستہ کے ان پتھروں سے کترا کر نکل جائے جو اس کے سفر میں حائل ہو رہے ہوں۔ لوگوں کی مخالفانہ باتوں پر مشتعل ہونے کے بجائے وہ تدبیری حکمت کے ذریعہ ان سے نپٹنے کی کوشش کرے۔ وہ کم ملنے پر راضی ہوتا کہ آئندہ اس کو زیادہ دیا جائے۔ وہ دشمنی پر صبر کرے تاکہ آج جو اس کے دشمن ہیں کل وہ اس کے دوست بن جائیں۔

نظریاتی جنون

دہلی کا انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۸ مئی ۱۹۸۸) آپ دیکھیں تو اس کے آخری صفحہ پر آپ کو ماسکو کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک خبر ملے گی جس کی سرخی یہ ہے :

Stalin uprooted 15 million people

اس سرخی کے نیچے جو مفصل خبر درج ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت روس میں سرکاری ٹیلی وژن پر ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جارہی ہے جس میں روس کے سابق اشتراکی حکمراں جوزف اسٹالن کے بھیانک مظالم کو واقعاتی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ اسٹالن نے اپنے زمانۂ اقتدار (۱۹۲۴-۱۹۵۳) میں ملک کے بے شمار باشندوں کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک سابق اشتراکی لیڈر بخارن (Nikolai Bukharin) بھی تھا جس کو ۱۹۳۸ میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ آج چالیس سال بعد اس کی بیوی لارینا (Anna Bukharin-Larina) اسٹیج پر آکر لوگوں کو بتا رہی ہے کہ اس کے شوہر کو بے قصور مارا گیا۔ اسٹالن نے بخارن کو مروادیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود اسٹالن ایک مسلّمہ مجرم تھا :

I consider him a criminal.

مذکورہ ڈاکومنٹری وہ مناظر دکھاتی ہے جب کہ روس کی زرعی زندگی کو مکمل طور پر برباد کر دیا گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ اسٹالن نے اجتماعی کھیتی کے منصوبہ کو بجبر عملی جامہ پہنایا۔ تین ملین سے زیادہ کسان گھرانے یا بالفاظ دیگر، پندرہ ملین زرعی باشندوں کو اس ڈکٹیٹر نے جڑ سے اکھاڑ دیا۔ ایک مبصر بتاتا ہے کہ روس کے زرعی نظام میں اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت روس غلہ کو درآمد کرنے والا ایک ملک بن گیا، جب کہ اس سے پہلے وہ غلہ کو برآمد کرنے والا ملک تھا :

The documentary shows scenes of wholesale destruction of rural life with the beginning of collectivisation. More than three million peasant households or 15 million people were uprooted by the dictator, and a commentator says this transformed the Soviet Union from an exporter of grains to an importer (p. 20).

اسٹالن جس وقت یہ ظالمانہ کارروائی کر رہا تھا، اس وقت روس غلہ کے معاملہ میں نہ صرف خود کفیل تھا، بلکہ وہ اپنے فاضل غلہ کو بیرونی ملکوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ دوسری طرف سعودی عرب اس وقت ایک صحرائی ملک شمار ہوتا تھا۔ اور اپنی ضرورت کا تقریباً تمام غلہ باہر کے ملکوں سے خریدتا تھا مگر آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ روس غلّہ خریدنے والا ملک بن گیا۔ دوسری طرف سعودی عرب میں ملکی ضرورت سے زیادہ غلہ پیدا ہونے لگا۔ ۱۹۸۸ میں سعودی عرب میں غلہ کی پیداوار دو ملین سے زیادہ ہوئی ہے۔ اس میں سے پچاس ہزار ٹن گیہوں اس نے سوویت روس کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسٹالن نے ایسا فعل کیوں کیا جو بیک وقت بدترین ظلم بھی تھا اور بدترین حماقت بھی۔ اس کا سبب، ایک لفظ میں، نظریاتی انتہا پسندی ہے۔ تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے بطور خود ایک نظریہ بنایا اور اس کو جبراً لوگوں کے اوپر نافذ کر دیا۔ مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا کیس نظریاتی جنون کا کیس تھا نہ کہ نظریاتی صداقت کا کیس۔

بہت سے لوگوں کا یقین محض نظریاتی جنون ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً یقین۔ بہت سے لوگوں کی قربانیاں محض اندھے جوش کے تحت ظاہر ہوتی ہیں نہ کہ فی الواقع سچائی کی طلب کے تحت۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اور اس امتحان گاہ کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ یہاں یقین بھی جھوٹی بنیادوں پر پیدا ہو سکتا ہے، اور عمل اور قربانی بھی۔

مسئلہ نہیں حقیقت

ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ وہ جس چیز کو "مسئلہ" سمجھے ہوئے ہیں، اس کو وہ "حقیقت" سمجھنے لگیں۔ جب ایک چیز کو مسئلہ سمجھا جائے تو اس کے خلاف غصہ اور جھنجلاہٹ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب اس کو حقیقت سمجھ لیا جائے تو آدمی کے اندر موافقت کا اور جدوجہد کا ذہن ابھرنے لگتا ہے۔

ایک سادہ سی مثال لیجئے۔ زمین میں جو کشش ہے، اس کی وجہ سے آدمی کے لیے بوجھ اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اگر زمین کی قوتِ کشش کم ہو جائے تو بھاری بوجھ لے کر چلنا بھی بالکل آسان ہو جائے گا۔ مگر کوئی شخص اس کی شکایت نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ اس کو مسئلہ نہیں بلکہ حقیقت سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شکایت اور احتجاج کرنے کے بجائے اس کے حل کی تدبیر ڈھونڈتا ہے مثلاً وہ اپنا بوجھ جانور پر لادتا ہے، یا وہ پہیہ دار گاڑی بنا کر اس کے ذریعہ بوجھ کو ادھر سے اُدھر لے جانے کا انتظام کرتا ہے۔ وغیرہ۔

یہی صورت حال سماجی مسائل کی بھی ہے۔ سماجی مسائل بھی دراصل مسائل نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ جس طرح زمین کی موجودہ کشش خدا کی پیدا کردہ ہے، اس پر ہم کو کوئی اختیار نہیں، اسی طرح سماجی مسائل بھی خدا کے منصوبہ کے تحت ہیں، وہ بہر حال باقی رہیں گے، ہم ان کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی ہم کو حکمت اور تدبیر کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو زمین کی کشش کے معاملہ میں ہم عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ مقابلہ کا یہ ماحول خود خدا کا قائم کردہ ہے، اس لیے ہم اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اس کے حل کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ اعراض، صبر، حکمت، جدوجہد اس قسم کے تمام الفاظ دراصل اسی تدبیر کے مختلف نام ہیں۔

مسائل کو مسائل سمجھنے سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوتا ہے، مسائل کو چیلنج سمجھنے سے تدبیر اور مقابلہ کا ذہن۔

Soviets ban probe on anonymous complaints

By William J. Eaton

MOSCOW: After generations of tragic experience under Czars and Commissars, the Soviet Union has decided to bar the police and other official bodies from conducting investigations on the basis of anonymous complaints.

The Communist Party daily *Pravda* reported Wednesday that the Presidium of the Supreme Soviet has decreed a halt to the practice, effective immediately. In the future, according to the decree, a citizen's complaint must be signed and must include the signer's full name and address — home address and working address. Any complaint "lacking this data shall be deemed anonymous and not be subject for consideration," the decree says.

If this policy is adhered to strictly, Western observers said, it would be a major step forward in an area of human rights that affects millions of Soviet citizens. Countless innocent victims have been sent to prison or marched before a firing squad in the Soviet Union on the word of some faceless accuser. Yet the law has continued to require the police to investigate anonymous charges, and this has given unscrupulous and ambitious individuals a powerful weapon to use against their enemies or rivals.

The police, acting on the theory that where there is smoke there must be fire, often required the targets of such charges to prove their innocence rather than require the accusers to furnish proof of guilt.

It was this kind of thinking, more than likely, that gave rise to the cynical saying "Never drink with two other people. You won't know who the informed was."

In recent years an anonymous accusation rarely led to a criminal charge, Soviet sources said, but it could affect a person's chances of travelling abroad and influence decisions concerning his work or his personal life.

According to a Muscovite who asked not to be identified by name, a policeman questioning a person who has been accused anonymously will customarily say he has received a "Signal" about him. "Now," he said, "I have a right to ask who sent that signal before I have to answer."

Soviet leader Mikhail Gorbachev's advocacy of greater "democratisation" was no doubt responsible, at least in part, for Wednesday's decree.

Krokodl, the satirical magazine, said that there was a time when anonymous accusations were regarded as useful tools for preserving ideological purity. But the attitude toward anonymous informers has changed, the magazine said, and added, "one simply cannot be an ideological stalwart and a foul caricature of a man at the same time."

Krokodil said that its staff would no longer read unsigned letters. The latest issue of the magazine reported that 138 anonymous complaints had been ceremoniously burned to underscore its new policy.

Another sign of the new attitude was a satirical movie cartoon that is being shown this week in Moscow movie houses. It depicts a jealous worker making his boss' life miserable by writing false accusations in an anonymous letter. As police inspectors appear menacingly to check out the charges, the boss becomes increasingly upset, then suffers a heart attack and dies. At his funeral he is hailed as a good man. A wreath bears a poignant reminder of his torment: "Charges not proven." (*Los Angeles Times*, Washington Post News Service)

The Hindustan Times, February 8, 1988.

بلا تحقیق الزام

ہندستان ٹائمس (۸ فروری ۱۹۸۸) میں اشتراکی روس سے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے مذکورہ اخبار نے اس کو لاس اینجلس ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نیوز سروس کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ رپورٹ کے مرتب کرنے والے سٹر ولیم ایٹن ہیں جو اخباری نمائندہ کے طور پر ماسکو میں مقیم ہیں۔ انھوں نے براہ راست روسی ماخذ سے لے کر اسے تیار کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس نے اس رپورٹ کو اپنے صفحہ ۲۴ پر حسب ذیل عنوان کے ساتھ شائع کیا ہے:

روسی گم نام شکایتوں کی تحقیق پر پابندی لگاتے ہیں۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ روس میں زار کے زمانہ سے یہ دستور رائج تھا کہ اگر کسی شخص کے خلاف ایک شکایت پولیس میں یا اور کسی سرکاری دفتر میں پہنچ جائے تو فوراً اس کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ خواہ شکایت کرنے والے نے اپنا نام اور اپنا پتہ بھی نہ لکھا ہو۔ ۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کے بعد بھی یہ الم ناک دستور نہ صرف رائج رہا بلکہ تیز تر ہو گیا۔ اب روس کے سرکاری اخبار پراودا نے اپنے شمارہ ۳ فروری ۱۹۸۸ میں یہ خبر دی ہے کہ سپریم سوویت کی پریسیڈیم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ بے نام شکایتوں پر کسی کے خلاف چھان بین کا باب کھولنے کے رواج کو فوری طور پر بند کر دیا جائے۔ ایسی ہر شکایت کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے جس پر شکایت کرنے والے نے اپنا نام اور پتہ تحریر نہ کیا ہو۔

روسی پولیس کا نظریہ اب تک یہ تھا کہ جہاں دھواں ہے وہاں آگ ضرور ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی کے خلاف گم نام شکایت موصول ہوتے ہی اس شخص کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ اب اس کے ذمہ یہ تھا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ قصور وار نہیں ہے۔ اس رواج کی بنا پر لاکھوں انسان ناقابل بیان مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ وہ جیلوں میں بند کر دئے گئے، انھیں گولی مار دی گئی۔ حالانکہ ان کے خلاف خبر دینے والے نے اپنی خبر کی کوئی دلیل بھی نہیں دی تھی۔

اس رواج کی بنا پر ہر آدمی کو لامحدود موقع مل گیا تھا کہ جس کو چاہے اندوہناک پریشانی میں مبتلا کر دے۔ مثلاً کسی دفتر کا ایک ملازم اپنے افسر اعلیٰ سے خفا ہو تو وہ اپنا نام ظاہر کئے بغیر اس کے

خلاف الزام مرتب کرے گا اور اس کو پولیس کے دفتر میں بھیج دے گا۔ اسی طرح جس شخص کو بھی کسی سے شکایت ہو وہ بغیر نام کی ایک تحریر پولیس دفتر کو بھیج دے گا اور فوراً اس کی پوچھ گچھ شروع ہو جاتی تھی۔ ایسے لوگ اگر خبر کی تفصیل پوچھتے تو پولیس کی طرف سے یہ مختصر جواب ملتا "ہم کو اوپر سے سگنل ملا ہے"۔ مذکورہ قانون کے تحت پہلی بار روسی شہریوں کو یہ حق حاصل ہوا ہے کہ وہ پولیس سے پوچھ سکیں کہ "کس نے تم کو یہ سگنل دیا ہے، اس کا نام بتاؤ"۔

روسی شہریوں کو جو حق اشتراکی انقلاب کے ۷۰ سال بعد ۱۹۸۸ میں ملا ہے، وہ اسلام نے ۱۴ سو سال پہلے اپنے قائم کردہ نظام میں اول روز ہی لوگوں کو دے دیا تھا۔

اسلام کی تعلیم

الحجرات قرآن کی ۴۹ ویں سورہ ہے۔ اس کو سورۃ الاخلاق والآداب بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور معاشرتی آداب بتائے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو ان الفاظ میں مذکور ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (الحجرات ۶)

اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن محمود النسفی نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

کأنہ قال أیّ فاسق جاءکم بأیّ نبأ (فتبینوا) فتوقفوا فیہ وتطلبوا بیان الامر وانکشاف الحقیقۃ ولا تعتمدوا قول الفاسق (صفحہ ۱۶۸)

گویا کہ یہ فرمایا کہ کوئی بھی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے معاملہ میں ٹھہرو اور واقعہ کی تفصیل معلوم کرو اور حقیقت حال کا پتہ لگاؤ۔ محض فاسق کے قول پر اعتماد نہ کرلو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے بارہ میں خبر دی گئی ہے، اس کے پیچھے پڑنے سے پہلے خود خبر دینے والے کی تحقیق کرو کہ وہ قابل اعتماد ہے یا ناقابل اعتماد۔ اور اگر شکایت کرنے والے نے اپنا نام بھی نہ بتایا ہو تو یہ صرف ایک بے بنیاد گمان ہے، اور گمان کی تحقیق کرنا اسلام میں منع ہے،

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے : اذا ظننت فلا تحقق (گمان کی تحقیق نہ کرو) حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے سے منع کر دیا گیا ہے (انا قد نُهینا عن التجسس)

اسی بنا پر ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب آپ سے متعلق روایات جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو محدثین نے علم حدیث میں وہ اصول مقرر کیا جس کو "جرح وتعدیل" کہا جاتا ہے، اور اس کے تحت ہر راوی کے ذاتی حالات کی تحقیق کی گئی۔ جب تک راوی کی ثقاہت ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کی روایت کو معتبر تسلیم نہیں کیا گیا۔

پھر اسی بنا پر فقہ میں یہ مستقل اصول مقرر کیا گیا کہ البینة علی المدعی (ثبوت کا بار مدعی کے اوپر ہے) جو شخص دعوی کرے، اسی کے اوپر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دعوے کے حق میں ثبوت فراہم کرے۔ نہ یہ کہ جس کے خلاف دعوی کیا گیا ہے، اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ تم اپنے بے قصور ہونے کو ثابت کرو۔

اشتراکی روس میں ۷۰ سال تک مذکورہ جابرانہ قانون کے اجرا کو اگر ارادی ظلم سمجھا جائے تو اشتراکیت کا معاشرہ سرخ جنت کے بجائے سرخ جہنم ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض اس کو ارادی ظلم نہ سمجھا جائے تو یہ ماننا ہوگا کہ مذہبی قانون وضعی قانون کے مقابلہ میں چودہ سو سال آگے ہے۔ ایسی حالت میں مذہب کو دور قدیم کی چیز قرار دے کر اس کو دور جدید کے لئے قابل ترک بتانا ایک ایسی بات ہے جو ثابت شدہ حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ ایسی حالت میں وضعی قانون کو فرسودہ قرار دیا جانا چاہئے نہ کہ الہامی قانون کو۔

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن کے پانچ پارے (سورہ یونس تا سورہ بنی اسرائیل) علیحدہ سے مجلد کرائے گئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس تذکیر القرآن کی ابتدائی جلد دس پاروں والی ہے وہ مذکورہ جلد کے لیے اپنی فرمائش روانہ فرمائیں۔

مینیجر مکتبہ الرسالہ

اخلاق کا معیار

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تو تم ایسا مت کرو کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے مطابق ہے (لایجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے: یعنی کسی کا بغض تم کو نہ ابھارے کہ اس کے معاملہ میں تم انصاف کو چھوڑ دو۔ بلکہ ہر ایک کے معاملہ میں انصاف کرو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ای لا یحملنکم بغض قوم علیٰ ترك العدل فیھم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقاً کان او عدواً)

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ موجودہ دنیا میں تقویٰ کا سب سے زیادہ یقینی معیار ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو دونوں بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں۔ مگر کسی کے اخلاق کو جانچنے کا یہ صحیح معیار نہیں۔ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے، اس کا اندازہ معتدل حالات میں نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کے درمیان تلخی اور شکایت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔

ایک پھل اندر سے کیسا ہے، اس کا اندازہ آپ پھل کے چھلکے کو دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب کہ پھل کو توڑا جائے۔ اسی طرح کوئی انسان حقیقتہً کیا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے ساتھ کوئی خلافِ مزاج واقعہ پیش آتا ہے، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ مگر جب اس کی شخصیت کو کوئی شدید جھٹکا لگتا ہے اس وقت اس کا اندر اس کے باہر آ جاتا ہے۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ وہ شریف تھا یا غیر شریف۔ وہ بے اخلاق تھا یا با اخلاق۔

جس شخص سے آپ کا بگاڑ نہیں ہوا اس سے خوش اخلاقی برت کر آپ خدا کے نزدیک خوش اخلاق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے نزدیک آپ اس وقت خوش اخلاق قرار پائیں گے جب کہ آپ اس شخص کے معاملہ میں خوش اخلاق ثابت ہوں جس سے آپ کا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

حقیقت پسند بنئے

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی منفی ذہنیت ہے۔ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ غیر اقوام کی تمام کارروائیوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف دشمنی کی بنا پر کی گئی ہیں۔ اس منفی ذہن نے ان کی پوری سوچ کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دیا ہے۔ آپ درخت کے نیچے ہیں اور اوپر سے پکا ہوا پھل آپ کے سر پر گر پڑتا ہے، اب اگر آپ یہ سوچیں کہ درخت نے آپ کی ضد میں آپ کے سر پر اپنا پھل گرایا ہے تو کبھی آپ معاملہ کا صحیح حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر امریکا فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ امریکا مسلمانوں کا دشمن ہے اور اس دشمنی کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مفادات کی دنیا ہے۔ امریکہ اس لئے اسرائیل کا ساتھ دیتا ہے کہ اس سے اس کا مفاد وابستہ ہے نہ کہ محض کسی کی ضد یا دشمنی کی وجہ سے۔

اسرائیل کی مدد سے امریکہ دوطرفہ مفاد حاصل کر رہا ہے۔ ایک یہ ہے کہ اس طرح وہ تیل پیدا کرنے والے خلیجی ممالک کو مسلسل دباؤ کی حالت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر یہ ممالک مجبور ہیں کہ وہ امریکہ سے امریکہ کی شرائط پر معاملہ کریں نہ کہ خود اپنی شرائط پر۔

دوسرا فائدہ کاروباری فائدہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں کا ایک نہایت محفوظ بزنس یہ ہے کہ وہ کمزور یا غیر ترقی یافتہ ممالک کو امداد کے نام پر قرض دیں اور اس پر ان سے سود وصول کریں۔ امداد کی رقم کی واپسی تو قسطوں میں ہوتی ہے مگر سود کی رقم ہر سال پوری کی پوری ادا کی جاتی ہے۔ یہ قرضے ترقیاتی کاموں میں بھی دئے جاتے ہیں مگر ان کی سب سے بڑی مد جدید ہتھیاروں کی خریداری ہے۔ ترقیاتی قرضے تو دوسرے ملکوں سے بھی ملتے ہیں مگر جنگی ہتھیاروں کی تجارت امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ اسرائیل اور عربوں میں مسلسل جنگ کی حالت امریکہ کو موقع دے رہی ہے کہ وہ اسرائیل کے ہاتھ قیمتی ہتھیار قرض کی بنیاد پر فراہم کرے اور اس پر اس سے بھاری سود وصول کرے۔ چنانچہ ایک اقتصادی رپورٹ کے مطابق اسرائیل امریکی قرضوں پر سود کی جو رقم ادا کرتا ہے اس کی سالانہ مقدار ۹۱۰ ملین ڈالر ہے۔ عرب ممالک امریکہ سے مہنگے داموں جو ہتھیار خریدتے ہیں ان کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔

۵۲

مسلمانوں کا مسئلہ

۱۵ مئی ۱۹۸۳ کو میں مرادآباد میں تھا۔ وہاں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کا موضوع تھا، دینی تقاضے۔ اور دوسری کا موضوع تھا، تعمیر ملت۔ تعمیر ملت کے موضوع پر جب تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب اٹھے جو نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دو سوالات کئے۔

پہلا یہ کہ آپ نے تعمیر ملت کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ سب اسباب کی باتیں ہیں مگر مرادآباد کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مرادآباد کے فساد (۱۹۸۰) کے آخری مرحلہ میں مسلمان اس طرح گھر گئے کہ ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دعا کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی اور شہر میں امن قائم ہو گیا۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر سارا معاملہ اسباب کا ہے تو اس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہیں، پھر مسلمان کا وہ امتیاز کیا ہے جو خیر امت کی حیثیت سے انھیں دیا گیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون عام (الرعد ۱۱) سے ہے اور آپ نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون اضطرار (النمل ۶۲) سے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ جب ایسے حالات میں گھر جائے جہاں بظاہر اس کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے (یونس ۲۳-۲۲) مگر جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے، حالت اضطرار میں مدد کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ کسی اضطراری واقعہ سے عمومی قانون اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے جو بات کہی وہ فساد سے پہلے کی ہے۔ اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ فساد کے بعد کی ہے۔ فساد کے بعد جب ہنگامی حالت پیدا ہو چکی ہو، اس وقت کیا کرنا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مگر فساد ہونے سے پہلے حالات کو معتدل رکھنے کے لئے کیا کیا جائے، یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں برداشت کو کھو دیا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی عدم برداشت کا مزاج تمام فسادات کا اصل سبب ہے۔ جب تک کہ اس مزاج کو دور نہ کیا جائے، کسی بھی دوسری تدبیر سے فسادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان پچھلے ۲۵ سال

سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اقلیتی کردار دینے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی حکومت اور حکمراں پارٹی سے تھی۔ بالآخر ۱۹۸۲ میں ان کو نئے ایکٹ کے تحت اقلیتی کردار دے دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس لڑائی کا نشانہ نئی دہلی تھا، اب اس لڑائی کا نشانہ خود ان کا مسلمان وائس چانسلر ہے

اس سے پہلے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں نے تقسیم ملک کی مانگ کی۔ اس مانگ کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مشترک ہندستان میں ملک کا اکثریتی فرقہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے مطابق ان کو پاکستان دے دیا گیا۔ مگر ان کے شکایتی ذہن نے اپنی شکایت کے لئے نیا نشانہ تلاش کر لیا۔ اب مشرقی پاکستان کو یہ شکایت ہوگئی کہ مغربی پاکستان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ دوبارہ خود اپنے درمیان ایک بھیانک لڑائی ہوئی جو اس پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ تاہم ۱۹۸۳ کے واقعات بتاتے ہیں کہ اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ اب سندھ کے مسلمانوں کو پنجاب کے مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ یہ لڑائی جاری ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا کر ختم ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہر بات میں ان کا بے برداشت ہو جانا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو ختم نہ کریں، ان کے لئے زمین تنگ رہے گی، خواہ وہ ایک ملک کا معاملہ ہو یا دوسرے ملک کا۔

دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان اپنے تقرر کے اعتبار سے بلاشبہ خیر امت ہیں اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ خدا کا ایک امتیازی معاملہ ہے۔ خدا نے مسلمانوں کے لئے اپنی ایک خصوصی مدد مقدر کی ہے جو اس نے دوسروں کے لئے مقدر نہیں کی۔ مگر اس خصوصی مدد کا استحقاق خیر امت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دینے پر ہے نہ کہ صرف نسلی مسلم نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر۔

یہ ذمہ داری دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ دعوت و تبلیغ سے مراد مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام نہیں ہے۔ بلکہ غیر مسلموں تک خدا کا سچا دین پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی ایک کرنے کا کام ہے اور اس کو ضرور کیا جانا چاہئے۔ مگر غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ وعدہ صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اتمام حجت کی حد تک پہنچایا جائے۔

قیادت کا دیوالیہ پن

ضبط کروں میں کب تک آہ　　چل رے خامہ بسم اللہ

بابری مسجد اور رام جنم بھومی (اجودھیا) کا جھگڑا سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تاہم اپنی موجودہ شکل میں یہ جھگڑا یکم فروری ۱۹۸۶ کو شروع ہوا جب کہ فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج، کرشن موہن پانڈے، کے عدالتی حکم کے تحت مقامی پولیس نے بابری مسجد کے دروازہ کا تالا کھول دیا جو ۱۹۴۹ سے بند چلا آرہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ عمارت عملاً ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی۔

یہ واقعہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ کیوں کہ وہ سنتِ رسولؐ کے خلاف تھا۔ قدیم مکہ میں کعبہ کے مقدس ترین خداخانہ کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اسی نوعیت کا سخت تر مسئلہ تھا۔ مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے سیاست پسند لیڈروں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ کعبہ کے مذکورہ مسئلہ کو رسول اللہؐ نے قومی لڑائی کا عنوان نہیں بنایا، بلکہ اپنی ساری توجہ انسانی ضمیر کو جگانے پر لگا دی۔

بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے بند، گرفتاری، دھرنا، ریلی، ایجی ٹیشن، جلسوں اور تقریروں کے ہنگامے جاری کر دیے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کہ مشرکین نے خانۂ خدا میں بُت داخل کر رکھے تھے، آپ نے ان مشرکین کے دلوں میں توحید کو داخل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ یہ طریقہ خدا کی صراط مستقیم کے مطابق تھا۔ چنانچہ اس کو صدفی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کوششوں سے لوگوں کے سینے توحید خانے بن گیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد بھی آخر کار بُت خانہ کے بجائے توحید خانہ میں تبدیل ہو گئی۔

بابری مسجد کے معاملہ میں مسلمانوں نے جو ہنگامہ برپا کیا ہے وہ سراسر ایک قومی ہنگامہ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ استحصال پسند لیڈروں کی پیروی میں ہے نہ کہ خدا کے پیغمبر کی پیروی میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خدا کی مدد نہ مل سکی۔ ان کے ان ہنگاموں سے

معاملہ صرف نازک تر ہوتا چلا گیا، وہ کسی بھی درجہ میں حل نہ کیا جا سکا۔

اس معاملہ میں مسلمانوں کو کم سے کم جو کرنا تھا وہ یہ تھا کہ یکم فروری ۱۹۸۶ کے بعد بھی وہ اسی طریقہ پر قائم رہتے جس پر وہ اس سے پہلے قائم تھے۔ یا دوسری سیکڑوں مسجدوں کے بارے میں آج بھی جس طریقہ کو وہ عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یعنی مذکورہ غلط فیصلہ کو قانون اور گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرنا۔ اور بالفرض اگر اس طرح کوئی حل سامنے نہ آئے تب بھی لازماً اسی پر قائم رہنا۔ کیوں کہ یہ ہرگز عقل مندی نہیں ہے کہ کوئی شخص آپ کی ایک چیز پر قبضہ کر لے اور آپ عدالت سے انصاف نہ پا رہے ہوں، تو آپ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیں۔

مسلمانوں کے استحصال پسند لیڈروں نے اس مسئلہ کو اس طرح ابھارا جیسے کہ وہ اسی کے منتظر ہوں، انھوں نے انتہائی جذباتی تقریریں کر کے مسلمانوں کا خون گرما دیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ انھوں نے اس کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ وہ پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ترین قومی تناؤ کا سبب بن گیا۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اجودھیا کو بلکہ پورے ملک کو اشتعال کی بھٹی کے کنارے کھڑا کر دیا۔ اسی کا براہ راست نتیجہ میرٹھ اور ملیانہ کا دردناک فساد تھا۔ ان فسادات میں لیڈر صاحبان کا تو کچھ نہیں بگڑا، البتہ بے شمار مسلم خاندان برباد ہو کر رہ گیے۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی (بابری مسجد موومنٹ کوآرڈی نیشن کمیٹی) کے چیرمین کا ایک انٹرویو افکار ملی (۳۱ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ ہے:

سوال ملک کے باشعور طبقوں کا کہنا ہے کہ دونوں قومیں بالمشافہ گفت گو سے مسئلہ کے کسی حل پر پہونچ سکتی ہیں۔ کیا اس مسئلہ کو گفتگو کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ (صفحہ ۲۶)

جواب لگاتار ایسی کوششیں ہوئیں اور ہر سطح پر ہوئیں۔ لیکن ابھی تک کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا۔ میرے ذاتی تجربہ کے مطابق، یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ کم از کم ایک بار اس قسم کی اعلیٰ سطحی میٹنگ میں میں خود شریک رہا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ نام نہاد مسلم لیڈروں کا رویہ ان مواقع پر انتہائی غیر معقول ہوتا ہے۔ ان میٹنگوں میں مسلم نمائندے بالکل وکیلانہ اور مناظرانہ بحث کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ حالاں کہ نازک اور حساس مسائل میں وکیلانہ اور مناظرانہ طریقہ صرف مسئلہ کو مزید پیچیدہ بناتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو حل نہیں کرتا۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو ہوئی تھی۔ یہ میٹنگ بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ پر تھی۔ ایک طرف بابری مسجد تحریک کے ذمہ داران تھے اور دوسری طرف ہندو شخصیتیں۔ ہندو جانب سے جو افراد شریک ہوئے، ان میں ایک ممتاز نام مہنت اوید ناتھ کا ہے جو رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے صدر ہیں۔ راقم الحروف بھی خصوصی دعوت کے تحت اس میٹنگ میں موجود تھا۔

اس موقع پر دونوں طرف کے لوگوں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ اکثر ہندو صاحبان نے مصالحت کے انداز میں تقریر کی۔ مہنت اوید ناتھ نے واضح اور متعین انداز اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد ہمارے نزدیک رام جنم بھومی پر بنائی گئی ہے۔ مسجد تو آپ دوسری جگہ بھی بنا سکتے ہیں مگر جنم بھومی تو وہیں رہے گی جہاں کہ وہ ہے۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ جگہ ہم کو واپس دے دی جائے۔ تاکہ ہم اس کو اس کی ابتدائی صورت میں تعمیر کر سکیں۔ مسلم نمائندے حسب معمول اس طرح تقریر کرتے رہے جیسے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے محض قومی وکیل بن کر اس مجلس میں شریک ہوئے ہیں۔

اجودھیا کے اس جھگڑے نے جو شدت اور نزاکت اختیار کر لی ہے، اس کے پیش نظر اس معاملہ میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو فیصلہ کی ایسی مشترک بنیاد پر لایا جائے جس سے دونوں اتفاق کر سکیں۔ قومی وکالت اور جارحانہ مناظرہ والا انداز کسی بھی درجہ میں حل کا دروازہ کھولنے والا نہیں بن سکا۔

مذکورہ میٹنگ میں جب دوسرے لوگ بول چکے تو حاضرین کے اصرار پر میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ سب سے پہلے میں نے یہ کہا کہ مسجد کا معاملہ اسلام میں بے حد نازک ہے۔ مسجد کا مسئلہ یہ ہے کہ جو مسجد ایک بار بن جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہے۔ اس کو نہ اس کی جگہ سے ہٹایا جا سکتا اور نہ کسی طرح اسے ختم کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسجد اگر واقعی وہ مسجد ہے تو مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے کبھی اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔

مگر اسی کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد ایک مقدس عبادت خانہ ہے۔ اس لیے مسجد کی تعمیر لازماً جائز زمین پر ہونا چاہیے۔ اگر غصب کی ہوئی زمین پر مسجد بنائی جائے تو اسلامی فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسی مسجد میں نماز جائز نہیں (لاتجوز فیہ الصلوٰۃ)

جہاں تک غیر مذاہب کے عبادت خانہ کو ڈھاکر اس کی جگہ مسجد بنانے کا سوال ہے، تو اصولاً یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مذاہب کے عبادت خانوں کو ڈھانا، قرآن کے مطابق ایک ظالمانہ فعل ہے (الحج ۴۰) خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں شام و فلسطین کے عیسائی علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کے لیے جو عہد نامے لکھے گیے، ان میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ ان کے مذہبی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے گی (لا یحال بینھم وبین شرائعھم) اہل فلسطین کے معاہدہ میں یہ بھی درج کیا گیا کہ ان کے گرجا میں رہائش نہ کی جائے گی اور نہ ان کو ڈھایا جائے گا اور نہ ان میں کچھ کمی جائے گی (لا یسکن کنائسھم ولا تھدم ولا ینتقص منھا)

ان تمہیدی باتوں کے بعد میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہمارے سامنے دو مطالبے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ شروع سے مسجد ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ وہ پہلے رام جنم استھان تھی۔ بعد کو اُسے توڑ کر مسجد بنایا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کی بنیاد کیا ہو۔

میں نے کہا کہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ صرف دعوی اور مطالبہ کی بنیاد پر اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ فیصلہ کے لیے کسی دوسری چیز کو بنیاد بنانا پڑے گا جو ان دونوں سے الگ ہو۔ یہ دوسری چیز صرف ایک ہو سکتی ہے، اور وہ تاریخ ہے۔ اس مسئلہ کو ختم کرنے کی واحد معقول صورت یہ ہے کہ دونوں فریق اس پر راضی ہو جائیں کہ تاریخ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو دونوں فریق بلا بحث قبول کر لیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ حضرات اگر اصولی طور پر اس بات کو مان لیں تو پھر میری تجویز ہے کہ مسلّمہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ یہ بورڈ خالص تاریخی حقائق کی روشنی میں معاملہ کا جائزہ لے اور تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر وہ جس رائے پر پہونچے اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دے۔ دونوں فریق پیشگی اقرار نامہ کے مطابق، اس کے پابند ہوں کہ مذکورہ بورڈ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو ہر دو فریق مزید بحث کے بغیر مان لیں گے۔

مزید میں نے کہا کہ اس بورڈ (یا تاریخی عدالت) میں حکومت کا بھی ایک باضابطہ نمائندہ موجود

ہو، تاکہ فیصلہ کے بعد اس کے عملی نفاذ کی یقینی ضمانت ہوسکے ۔

میری تقریر تمام لوگ بیحد غور کے ساتھ سنتے رہے۔ جب وہ ختم ہوئی تو مہنت اویدناتھ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم کو یہ بات منظور ہے ۔ اس انداز پر بات کو آگے بڑھایا جائے ۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا صاحب (راقم الحروف) سے ہیں تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے بتائے ہوئے راہ عمل پر چلا گیا تو یہ مسئلہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائے گا ۔

بات یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ عین اس وقت بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے چیرمین ، جو کہ ایم پی بھی ہیں، مشتعل ہو کر چیخنے لگے ۔ وہ اتنے زور زور سے بول رہے تھے کہ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں بمشکل میں اتنا سن سکا کہ "ہم اس تجویز پر راضی نہیں ہیں"

اس گفتگو کے موقع پر جماعت اسلامی کی طرف سے بھی اس کے ایک ذمہ دار بزرگ شریک تھے ۔ مگر نا قابل فہم سبب کے تحت وہ مکمل طور پر خاموش رہے ۔ یہاں تک کہ چیرمین صاحب کی چیخ پکار کے ساتھ میٹنگ برخواست ہو گئی ۔

میرے لیے یہ بات نا قابل فہم ہے کہ مسلم لیڈروں نے میری مذکورہ بات سے اختلاف کیوں کیا۔ جب کہ اپنے اعلان کے مطابق ، وہ خود اسی قسم کے باعزت حل کی تلاش میں ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ "کریڈٹ" کے مسئلہ نے انھیں اس اختلاف پر مجبور کیا۔ وہ اپنے سیاسی مزاج کے تحت ایک ایسے حل پر راضی نہ ہوسکے جس کا کریڈٹ ان کے سوا کسی اور کو مل رہا ہو ۔

مسٹر گووند مکھوٹی (صدر دہلی بار ایسوسی ایشن) نے بابری مسجد کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے :

"اس قضیہ کا فیصلہ کسی بھی عدالت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے آسان صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے روشن خیال لوگ خلوص دل سے اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کا فیصلہ کریں" افکار ملی، ۳۱ مئی ۱۹۸۸، صفحہ ۳۷

اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ میں یہی سب سے زیادہ قابل عمل بات ہے۔ جس قضیہ سے عوامی جذبات اتنے زیادہ وابستہ ہوں یا وابستہ کر دیئے جائیں۔ اس کو محض عدالتی حکم کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یکم فروری ۱۹۸۶ کو فیض آباد کی عدالت نے ایک حکم دیا تھا۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ ہندوؤں

نے اس کو مانا، اور مسلمانوں نے اس کو نہیں مانا۔ اسی طرح کوئی دوسری عدالت اس سے مختلف حکم دے تو مسلمان اس کو مانیں گے مگر ہندو اس کو نہیں مانیں گے۔ اور پھر مسئلہ جہاں تھا وہیں باقی رہے گا۔

ایسے ہی نازک اجتماعی معاملات کے لیے حکم اور ثالث کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یہ "عدالت" کی وہ قسم ہے جس میں دونوں فریق پیشگی اقرار کے ذریعہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کے فیصلہ کو مانیں گے، خواہ وہ ان کے موافق ہو یا ان کے خلاف۔ اوپر ہم نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی مشترک میٹنگ کی جو روداد درج کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ ڈیڑھ سال پہلے یہ مسئلہ مکمل طور پر اس قسم کے ایک باعزت حل کے قریب پہونچ گیا تھا۔ یہ گویا "تاریخ کی عدالت" کو حکم بنانے کے ہم معنی تھا۔ مگر انھیں سیاست باز لیڈروں نے اس حل کو واقعہ بننے نہیں دیا جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر لیڈری کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی کے چیئرمین صاحب کا ایک انٹرویو افکار ملی (۳۱ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک سوال و جواب یہ ہے:

سوال تحریک بازیابی بابری مسجد کی اب تک کی کارکردگی کے بارہ میں آپ کا کیا تبصرہ ہے۔

جواب دو سال میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آج ملک کے ایجنڈے پر بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ حکومت آخری دم تک اس کو مقامی مسئلہ کہتی رہی ہے۔ لیکن آج حکومت تسلیم کرتی ہے کہ یہ ملکی مسئلہ ہے۔ اس طرح ہم اسے ملکی سطح پر لے آئے۔

یہ بلاشبہ صرف ایک غیر سنجیدہ لفاظی ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی ایجنڈے پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی تشدد کی فہرست پر ہے۔ اس تحریک نے ایک مقامی نزاع کو ایک ملکی نزاع بنا دیا ہے۔ عام حالت میں جو چیز صرف ایک قصبہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ کا سبب بن سکتی تھی، اس کو پورے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا سبب بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "چیئرمین صاحب" نے جس چیز کو اپنی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا ہے، وہی اس کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

"اجودھیا" اور "رام جنم بھومی" ہندو عقیدہ کے مطابق ان کے مقدس مقامات ہیں۔ وہ ہندو قوم کے لیے انتہائی حساس اشو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے نازک اور حساس سوال کو مقامی کشمکش

کے دائرہ سے نکال کر ملکی کشمکش کے دائرہ میں لانا، مجرمانہ حد تک ایک غلط فعل ہے۔ مزید یہ کہ یہ اصل مسئلہ کے حل میں رکاوٹ بھی ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے ہندوؤں کو اپنی مخالفت پر کھڑا کر دیا جائے۔ دورِ جمہوریت میں اس توسیع کے معنی کیا ہیں، اس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔

میں ذاتی طور پر دہلی کی کم از کم نصف درجن مسجدوں کو جانتا ہوں جو ۱۹۴۷ کے بعد اغیار کے قبضہ میں چلی گئی تھیں۔ بعض مسلمانوں کے دل میں ان کا درد پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ لیڈر نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے خالص مقامی انداز میں اس کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے نہ جلسہ جلوس کی دھوم مچائی۔ اور نہ اخبارات میں بیانات شائع کیے۔ بس خاموش انداز میں دفتری اور قانونی کارروائی کرتے رہے۔ انھیں اس کام میں مقامی ہندوؤں کا بھی موثر تعاون ملا۔ ان میں سے کئی مسجدوں کا رقبہ بابری مسجد سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ مگر یہ تمام مسجدیں مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی تقریریں کرکے ایک مسجد کو مقامی اشو کے بجائے ملکی اشو بنانا سستی لیڈری حاصل کرنے کی کوشش تو ہو سکتی ہے، مگر وہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش ہرگز نہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد تحریک کے "چیئرمین" کے جس انٹرویو کا ذکر اوپر ہوا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

سوال کیا مسلم قائدین اجودھیا مارچ میں شریک ہوں گے، یا مسلم قائدین گھر میں بیٹھیں گے اور عوام مارچ میں نقصان اٹھائیں گے۔

جواب ترتیب پر منحصر ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی فوج نہیں دیکھی جس میں جنرل بھی آگے جاکر لڑتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا احمقانہ ہے کہ صرف قائدین آگے چلے جائیں۔ یا یہ کہنا کہ محض عوام ہی آگے رہیں قائدین آگے نہ آئیں (افکار ملی، ۳۱ مئی ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴)

بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۷) کے بعد سے بار بار مارچ (کوچ) کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے نام نہاد قائدین کی میٹنگیں ہوتی تھیں، مگر ہر بار تاریخ کا تعین کیے بغیر میٹنگ برخواست ہو جاتی تھی۔ عام لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ مارچ کی تاریخ کا تعین اس لیے نہیں کیا جارہا ہے کہ مارچ کے پُرخطر اقدام میں لیڈر کو آگے رہنا پڑے گا۔ اور لیڈر صرف ملت کے بچوں کو یتیم بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ اپنے بچوں کو یتیم بنانا نہیں چاہتا۔

مگر مذکورہ سوال وجواب بتاتا ہے کہ لیڈر کے سیاسی ذہن نے غالباً اس مشکل کا حل دریافت کرلیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر مارچ ہو تو لیڈر مارچ کا "جنرل" بن جائے۔ وہ مارچ سے دور کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر مارچ کی رہنمائی کرے۔ مگر اس قسم کی جھوٹی ہوشیاری لیڈر صاحبان کے کام آنے والی نہیں۔ کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جنرل ایک منظم فوج کو دوسری منظم فوج سے لڑاتا ہے۔ جب کہ مارچ (کوچ) اس قسم کی لڑائی نہیں۔ مارچ اصلاً ایک مظاہرہ ہے۔ اور مظاہرہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک لیڈر کی گاڑی اس کے آگے آگے نہ چل رہی ہو۔

اجودھیا مارچ کا فیصلہ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بوٹ کلب ریلی کے موقع پر ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو کیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل مسلمانوں کے جذبات اس عنوان پر ابھارے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ فیض آباد کی میٹنگ (۲۲ مئی ۱۹۸۸) میں "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے ذمہ داروں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو طویل مارچ کر کے اجودھیا پہنچیں گے اور ہر قیمت پر بابری مسجد میں داخل ہو کر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر (جو کہ ایم پی بھی ہیں) نے ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا اعلان کیا (قومی آواز، ۲۳ مئی ۱۹۸۸)

یہ فیصلہ بلاشبہ مجنونانہ حد تک غلط ہے۔ اس قسم کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو لیڈری کی ہوس میں اندھے ہو چکے ہوں۔ اور انھیں اپنی لیڈری کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہ دیتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد قیادت نے بابری مسجد کے بارہ میں جوش دلا کر مسلمانوں کو اب ایک ایسے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے ایک طرف گہری کھائی ہے اور دوسری طرف خونخوار بھیڑیا۔

اب ظاہر ہے کہ صرف دو امکان ہے۔ یا تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے اعلان کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا مارچ ہو، یا اجودھیا مارچ نہ ہو۔ تاہم دونوں میں سے جو بات بھی ہو گی وہ یقینی طور پر سنگین ترین نتائج پیدا کرے گی۔ موجودہ صورت حال میں جب کہ دونوں طرف کے لوگوں کے جذبات انتہائی حد تک بھڑکا دیئے گئے ہیں، دونوں میں سے کوئی بات بھی سادہ بات نہیں ہو سکتی۔

اگر مذکورہ اعلان کے مطابق، مسلمانوں کا جتھا مارچ کرتے ہوئے اجودھیا پہونچتا ہے اور بابری مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کو نہایت خونخوار مزاحمت

کا سامنا کرنا ہوگا۔ تقریباً یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کا اقدام میرٹھ اور ملیانہ سے بھی زیادہ بُرے انجام کی طرف جان بوجھ کر چھلانگ لگانے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔ سطحی قسم کے قائدین اس کے بعد "ظلم اور سازش" کے انکشاف میں سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر یقینی طور پر یہ مسلم قیادت کے دیوالیہ پن کا ثبوت ہوگا نہ کہ کسی دوسرے کے ظلم اور سازش کا۔

اور اگر لیڈر کا زرخیز دماغ کوئی عذر نکال کر اجودھیا مارچ کو ملتوی یا منسوخ کر دے تو یہ بلاشبہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کی ریلی میں مسلم مقررین نے جس طرح فریق ثانی کو دھمکیاں دی تھیں، اس کے بعد سے اب تک تمام چھوٹے بڑے مسلم قائدین جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے، جس طرح جلسوں کی بھیڑ میں بابری مسجد لے کے رہیں گے جیسے "فلک شگاف" نعرے لگائے جاتے رہے، اس کے بعد مارچ کا التواء محض سادہ واقعہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں نے الفاظ کے بے پناہ اسراف سے جو ملکی فضا بنائی ہے، اس کے بعد اگر وہ اقدام سے باز رہتے ہیں تو یہ فریق ثانی کی نظر میں سخت ترین بزدلی کا مظاہرہ ہوگا جس کی تلافی مستقبل بعید تک بھی ناممکن ہوگی۔ اس کے بعد وہ ذلت اور حقارت کے ایسے دور میں داخل ہو جائیں گے جس کا اب تک انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نا اہل قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو اب ایسے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے لیے انتخاب (Choice) بربادی اور غیر بربادی میں نہیں ہے، بلکہ ایک بربادی اور دوسری بربادی میں ہے۔ شاید عربی شاعر نے اسی قسم کی نکمی قیادت کے بارہ میں یہ شعر کہا تھا کہ جب کوّا کسی قوم کا سردار ہو جائے تو وہ ان کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گا:

اِذَا كَانَ الْغُرَابُ رَئِيسَ قَوْمٍ
سَيَهْدِيهِمْ اِلَى دَارِ الْبَوَارِ

یہاں ہم ہفت روزہ نئی دنیا (۳-۹ جون ۱۹۸۸) کا ایک پیراگراف نقل کریں گے۔ اس نے اجودھیا مارچ کے مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے "خودکشی یا جہاد" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"کیا حق ہے اور کیا ناحق، اس سے قطع نظر، آج کے ہندستان کی حقیقت یہ ہے کہ فاشسٹ اور فرقہ پرست عناصر اس مارچ کے سوال کو لے کر ہندستان کے امن و امان کو آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔ سید شہاب الدین یا بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کچھ لیڈر کتنی بھی من شانتی کی بات کریں اور گاندھیائی

انداز میں مارچ کرتے کا نعرہ لگائیں، عام آدمی کے ذہن میں اس مارچ کا مطلب ہندو مسلم ٹکراؤ ہوگا، جو فاشسٹ طاقتیں ہندستان سے سیکولرزم کا جنازہ نکالنا چاہتی ہیں، مارچ کو بہانہ بناکر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ فساد کرانے اور ہنگامے کرانے کی سازشیں کریں گی۔ جس طرح میرٹھ کے قتل عام کے موقع پر مسلم قیادت بے دست و پا نظر آرہی تھی، اسی طرح اس موقع پر بھی خاموش تماشائی ہی نظر آئے گی، اور کٹے گا، مرے گا، لٹے گا عام مسلمان، غریب مسلمان، بدحال، بے بس مسلمان۔ مارچ کے اس فیصلہ کے ساتھ مسلم لیڈروں کو اس بات کو سامنے رکھنا ہوگا کہ ان کا موقف کتنا بھی درست کیوں نہ ہو، ان کی حکمت عملی کے نتائج کیا ہوں گے۔ اور یہ نتائج کسے بھگتنے ہوں گے۔ اور سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ ہوگی کہ ان سب قربانیوں کے باوجود اس راستہ کو اپناکر مسلمانوں کو بابری مسجد نہیں مل سکے گی۔ خود بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قائد بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں" صفحہ ۱

حقیقت حج

از: مولانا وحید الدین خاں



حج کا سفر خدا کی طرف سفر ہے۔ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ دوسری عبادتیں اللہ تعالیٰ کی یاد ہیں۔ جب کہ حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ عام عبادت اگر غیب کی سطح پر خدا کی عبادت ہے تو حج شہود کی سطح پر خدا کی عبادت کرنا ہے۔

(صفحات ۱۱۳ قیمت ۲۵ روپیہ، مختصر: صفحات ۴۸ قیمت ۴ روپیہ)

ایک سفر

۳ اپریل ۱۹۸۸ کو سہارن پور سے کچھ صاحبان اسلامی مرکز میں آئے۔ یہ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ آل انڈیا اردو تعلیمی بورڈ اور فخر الدین علی احمد اکیڈمی کے مشترکہ فیصلہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ محمود علی خاں نیشنل انٹگریشن ایوارڈ (۱۹۸۸) آپ کو دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم سہارن پور میں ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو ایک خصوصی تقریب منعقد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھ کو آپ ایوارڈ نہ دیجئے، مجھ کو آپ دعا دیجئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک میں ان کے ذہن کو بدلنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ کسی قیمت پر راضی نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ مجبوراً مجھے اس پیش کش کو منظور کرنا پڑا۔

ان معاملات میں میرا مزاج اس سے مختلف ہے جس کی کہانیاں مسلمانوں، نیز غیر مسلموں کی مذہبی شخصیتوں کے بارے میں پر فخر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کو فلاں چیز کی پیش کش کی گئی اور انھوں نے اس کو بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ ذاتی طور پر میں اس روش کو تواضع کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میرے تمام جاننے والے جانتے ہیں کہ طبعاً میں گمنامی میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ شہرت اور اعزاز سے مجھے بیزاری کی حد تک وحشت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کو ذہنی پستی کی علامت سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص دوسروں کی طرف سے ملنے والے اعزاز پر خوش ہو یا اس کا طالب بنے۔ اس قسم کے اعزازات کی طلب بلاشبہ مومنانہ نفسیات کے خلاف ہے۔ مگر یہ بات بھی مومنانہ نفسیات کے خلاف ہے کہ آدمی اس قسم کی پیش کش کو اصرار کے باوجود ٹھکرا دے۔ کیوں کہ یہ اس تواضع کے مطابق نہیں جو اس دنیا میں مومن ومسلم کا اصل سرمایہ ہے۔

جیمس رسل لاول (James Russel Lowell) نے کہا ہے کہ وہ چیز جس کو لوگ بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ اعزاز ہے خواہ وہ جنازہ کے ماتمی جلوس کی پیشوائی کیوں نہ ہو:

What men prize most is a privilege, even
it be that of chief mourner at a funeral.

یہ اعزاز پسندی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ تاہم اصل مطلوب، اعزاز والی چیز کو رد کرنا نہیں بلکہ

اعزاز پسندی کی نفسیات کو رد کرنا ہے۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ یہ دوسری چیز اکثر ان لوگوں میں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہوتی ہے جو تمغہ اعزاز کو رد کرنے کے چیمپئن بنتے ہیں۔ کیوں کہ اعزاز کو رد کرنا عوام کی نظر میں انھیں مزید برتر اعزاز کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔

سہارن پور دہلی سے ۱۶۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر مغربی یوپی میں واقع ہے۔ یہ شہر ۱۳۴۰ء میں آباد ہوا۔ اس وقت کے ایک مسلم بزرگ شاہ حاران چشتی کے نام پر اس کا نام "شاہ حاران پور" رکھا گیا جو بعد کے استعمال میں سہارن پور ہوگیا۔ ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہردوار اسی ضلع میں واقع ہے۔ مشہور عربی درس گاہ دارالعلوم دیوبند بھی اسی ضلع میں ہے جو ابتداءً ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ خود شہر سہارنپور میں مظاہر العلوم کے نام سے ایک بڑا تعلیمی ادارہ موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے دینی مدارس درجنوں کی تعداد میں اس کے علاوہ ہیں۔ سہارن پور شہر کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ فی صد بتائی جاتی ہے۔ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے یہاں کے مسلمان نسبتاً اچھی حالت میں ہیں۔

رڑکی بھی اسی ضلع میں ہے جہاں ہندستان کی پہلی انجنیرنگ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ رڑکی کے تصور سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب ہیں جنھوں نے ۱۹۵۵ میں بی ایس سی (انجنیرنگ) کیا تھا۔ اس وقت ہندستان میں صرف رڑکی میں ایم اے (انجنیرنگ) کا کورس تھا۔ مزید یہ کہ اس وقت یہ کورس صرف ایک سال کا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اب آپ رڑکی انجنیرنگ کالج میں داخلہ لے لیں اور انجنیرنگ میں ماسٹر ڈگری کا کورس کر لیں۔ مگر انھوں نے میرا مشورہ نہیں مانا اور ملازمت میں چلے گئے۔

بعد کو ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کا مشورہ نہ مان کر سخت غلطی کی۔ میں ٹیچنگ کے کام کو پسند کرتا ہوں مگر ماسٹر ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے میں یونیورسٹی میں جگہ حاصل نہ کر سکا۔ آخر کار مجھے ایڈمنسٹریشن میں جانا پڑا۔ وہ ایک شریف آدمی ہیں۔ رشوت وغیرہ سے بہت دور رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسے آدمی کے لئے یونیورسٹی ٹیچر کی زندگی بہترین زندگی تھی۔ ایڈمنسٹریشن کے لئے، کم از کم اس ملک میں، تو میں بالکل ہی غیر موزوں ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں مستقل طور پر ذہنی الجھن میں رہتا ہوں۔ مجھے کبھی وہ چیز نہ مل سکی جس کو اطمینان کار (Job satisfaction) کہا جاتا ہے۔

مذکورہ کہانی بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا: "میں نے اپنا ایک سال بچانا چاہا تھا، اس کے نتیجہ میں میری پوری زندگی کھوئی گئی، اور آپ جانتے ہیں کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔"

دہلی سے سہارنپور تک کا سفر (۹ اپریل ۱۹۸۸) پروفیسر ایم ایس اگوانی (وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کے ساتھ ہوا۔ وہ ایک علم پسند اور صاحب مطالعہ آدمی ہیں۔ چنانچہ پورے راستہ میں ان کے ساتھ مفید تبادلہ خیال جاری رہا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنا ڈاکٹریٹ ہالینڈ کی واخی ننگن یونیورسٹی (Wageningen Agricultural University) سے ۱۹۵۳ میں کیا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لئے ان کے مقالہ کا عنوان یہ تھا:

The United States and the Arab World.

انھوں نے بتایا کہ واخی ننگن میں وہ تقریباً دو ہفتہ ایک عیسائی پروفیسر ہافسٹی (Prof. Hofstee) کے یہاں مقیم رہے۔ یہ پروفیسر صاحب پروٹسٹنٹ تھے۔ ان کے یہاں کھانا پکانے کے لئے ایک خادمہ تھی جو کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتی تھی۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک میں اتنا زیادہ مذہبی اختلاف ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اس مذہبی اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کا مکمل احترام کرتے تھے۔ گھر کے مالک، ان کے بیوی بچے اور خادمہ سب ایک ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کیتھولک لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کھانے سے پہلے کچھ دعائیہ کلمات پڑھتے ہیں، اس کے بعد انگلی سے اپنے سینہ پر صلیب کا نشان بناتے ہیں، پھر کھانا شروع کرتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر اور ان کے گھر کے لوگ کھانے کے وقت میز کے کنارے بیٹھ جاتے تھے۔ سب سے پہلے کیتھولک خادمہ اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق مختصر دعائیہ رسم ادا کرتی۔ اس وقفہ میں گھر کے تمام پروٹسٹنٹ افراد خاموشی کے ساتھ گردن جھکائے ہوئے اپنی کرسیوں پر بیٹھے رہتے۔ اور صرف اس وقت کھانا شروع کرتے جب کہ کیتھولک خادمہ اپنی دعائیہ رسم سے فارغ ہو جاتی۔

سہارن پور جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف مسلسل ہریالی اور باغ کا منظر تھا۔ یعنی وہی منظر جس کی قرآن میں ان الفاظ میں تصویر کشی کی گئی ہے: لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ (سبا ۱۵) قرآن میں اہل سبا کے سرسبز باغات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان کو اس نعمت پر شکر کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر انھوں نے اعراض کیا۔ یہاں تک کہ وہ ان باغات سے محروم کر دیے گئے۔

اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے ذہن میں آیا کہ عام طور پر لوگ شکر کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خود

اپنی ذات کے لئے کوئی نعمت ملے تو اس پر شکر کا کلمہ کہہ دیا جائے۔ مگر یہ شکر کی بہت ناقص اور محدود شکل ہے کیوں کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں احسانات خداوندی کا بظاہر ایک چھوٹا سا جزء ہی کسی فرد کو ذاتی طور پر ملتا ہے۔ اب اگر صرف ذاتی عطیہ پر شکر کرنا ہو تو آدمی کے اندر شکر کی ایک چھوٹی نہر تو جاری ہو سکتی ہے مگر شکر کا اتھاہ سمندر اس کے سینہ میں موجزن نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر خداوند عالم کی بے پایاں عظمتوں کے اقرار کا نام ہے۔ شکر کا یہ درجہ کسی شخص کو اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ وہ خدا کے عظیم تر احسانات پر جذبہ شکر سے سرشار ہو سکتا ہو۔ محدود احسان کے تصور سے محدود شکر پیدا ہوتا ہے۔ اور لامحدود احسان کے تصور سے لامحدود شکر۔

راستہ میں ہمارا قافلہ دیوبند سے گزرا۔ یہ سہارن پور کا مشہور قصبہ ہے۔ قدیم عربی درس گاہ "دارالعلوم" یہیں واقع ہے۔ دارالعلوم کی النادی الادبی کی دعوت پر ستمبر ۱۹۷۱ کے پہلے ہفتے میں دیوبند آیا تھا۔ النادی الادبی کے سالانہ اجتماع میں مجھے مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔

اس سفر کے موقع پر دیوبند میں میری کئی تقریریں ہوئی تھیں۔ اس کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۱۷ ستمبر ۱۹۷۱) میں شائع ہو چکی ہے۔ ایک تقریر میں میں نے کہا تھا: "موجودہ حالات بظاہر دل شکن ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی زیادہ لٹ گیا ہو، پھر بھی اس کے پاس کچھ چیزیں باقی رہتی ہیں۔ اور اگر دانش مندی سے کام لے کر ان موجود چیزوں کو استعمال کیا جائے تو ہر بربادی کے بعد نئی عظیم تر تعمیر کا امکان نکل آتا ہے۔"

دیوبند کے ایک طالب علم کی فرمائش پر میں نے حسب ذیل سطریں اس کی ڈائری میں لکھی تھیں:
"زندگی اس کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ مگر اس متاع کی قیمت بازار حیات میں اس وقت ملتی ہے جب کہ آدمی خود اس کی قیمت دے چکا ہو۔ زندگی وہ سودا ہے جو خارجی بازار میں فروخت ہونے سے پہلے خود آدمی کے اپنے اندر فروخت ہوتا ہے۔ یہ آپ کے حوصلہ کا امتحان ہے۔ آپ خود اپنی جتنی زیادہ قیمت لگائیں گے، بازار عالم میں اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت لگے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی دوسروں کی نظر میں زیادہ قیمتی ٹھہرے تو سب سے پہلے خود اس کے خریدار بنئے۔ یہ دوسرے نہیں بلکہ خود آپ ہیں جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ بازار عالم میں آپ کی قیمت کتنی مقرر ہو گی (۴ ستمبر ۱۹۷۱)

رائے پور ایک قصبہ ہے جو سہارن پور ضلع میں واقع ہے۔ یہاں مولانا عبد القادر رائپوری

(۱۹۶۲ - ۱۸۷۲) کی خانقاہ ہے۔ میں دو بار اس خانقاہ میں گیا ہوں۔ یہ سفر بھی سہارن پور کے راستہ سے ہوا۔ پہلی بار جنوری ۱۹۷۲ کے آخری ہفتہ میں رائے پور کا سفر ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں دو گھنٹے کے لئے سہارن پور میں بھی قیام رہا۔ اس سفر کی روداد الجمعیۃ ویکلی ۱۸ فروری ۱۹۷۲ میں شائع ہو چکی ہے۔

اس سفر میں کچھ وقت قصبہ بہیٹ میں شاہ مسعود صاحب کے یہاں گزرا۔ وہ مولانا رائے پوری کے بہت قریبی لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "حضرت کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ مسلمان نئے زمانہ کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ جب تک نئے زمانہ کے لحاظ سے تیاری نہ کی جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے، نئے زمانہ میں کوئی جگہ حاصل نہیں کی جا سکتی"۔ شاہ مسعود صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں نے حضرت رائے پوری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ " دو سو سال سے ملّت کا ستارہ گردش میں ہے "۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ۱۹۳۵ سے مستقل طور پر رائے پور میں مقیم تھے۔ انھوں نے مولانا رائے پوری کے ملفوظات بڑی مقدار میں قلم بند کر رکھے تھے۔ انھوں نے اپنی ڈائری مجھے دیکھنے کے لئے دی۔ اس میں یکم شوال ۱۳۷۰ھ کی رائے پور کی ایک صحبت کے تحت درج تھا کہ " حضرت نے فرمایا کہ اب مسلمانوں کو اپنی پستی سے اٹھنے کے لئے سو سال درکار ہیں، بشرطیکہ وہ صحیح راستہ پاکر اس پر عمل شروع کر دیں "۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۱ کی تاریخ کے تحت درج تھا کہ "حضرت نے آج کی مجلس میں فرمایا کہ ہماری قوم کا عجیب قصہ ہے۔ وہ تیاری تو کرتی نہیں، شور مچاتی ہے۔ غوغائی لوگ ہیں۔ ان کو اب، بشرطیکہ جائزہ لے کر کام کریں، سو سال اٹھنے کو چاہئیں"۔ جب سنا کہ پاکستان میں مسٹر جناح کے نام پہ ایک نیا شہر " قائد آباد " بسایا گیا ہے تو فرمایا کہ ہماری قوم کا عجیب حال ہے۔ اگر ہم پانچ دس لاکھ آدمی قتل کرا دیتے تو ہمارے نام پر بھی شہر آباد کر دیتے۔ جو ان کو تباہ کرے، یہ اس کے ساتھ لگتے ہیں "۔

رائے پور (ضلع سہارن پور) کا دوسرا سفر جولائی ۱۹۷۲ کے دوسرے ہفتہ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الجمعیۃ ویکلی ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ میں مفصل طور پر شائع ہو چکی ہے۔ یہ دونوں سفر حافظ عتیق الرحمٰن دہلوی کے ساتھ ہوئے۔ خانقاہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ تقسیم ہند سے پہلے جب مسلم لیگ کا طوفان برپا تھا اور ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے، حضرت نے فرمایا: " یہ سب نعرے تو میری سمجھ میں

آتے نہیں۔ مجھے تو دہریت کی گھٹائیں آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا۔

مسلمانوں کی یہ غوغائی سیاست آج بھی بدستور جاری ہے "دوسو سالہ گردش" کی مدت بڑھتی جارہی ہے، اور مسلم قائدین میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرکے از سر نو صحیح سمت میں سفر شروع کرنے کے لئے تیار ہو۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۸ کی دوپہر کو جب میں سہارن پور پہنچا تو یہ سہارن پور میں میرے باقاعدہ قیام کا پہلا واقعہ تھا۔ یہاں اندازہ ہوا کہ الرسالہ کا مشن یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر پہنچ چکا ہے۔ اور اسی طرح اطراف کی بستیوں میں بھی۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ نام نہاد مسلم قائدین اب تک انھیں جو رہنمائی دیتے رہے وہ حقیقۃً رہنمائی نہیں تھی بلکہ قیادتی استحصال تھا۔ الرسالہ کے ذریعہ پہلی بار وہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں ایک ایسی راہ عمل مل رہی ہے جس پر وہ نتیجہ خیز طور پر سرگرم عمل ہو سکیں۔ ایک صاحب نے اپنا تاثر ان لفظوں میں بیان کیا کہ اگر الرسالہ کا پیغام مجھے پہلے مل جاتا تو میں بہت سی ان حماقتوں سے بچ سکتا تھا جو میں نے مسلم قائدین کے خطیبانہ الفاظ سے متاثر ہو کر کیں۔

نوجوانوں کی بڑی تعداد اس طرح پرشوق طور پر ملاقات کرتی رہی جیسے کہ انھوں نے صاحب الرسالہ کی شکل میں اپنا مستقبل دریافت کر لیا ہو۔

کئی نوجوانوں نے آٹو گراف لئے۔ میں نے ایک نوجوان کی بک پر لکھنا شروع کیا: زندگی اس سے زیادہ ..." اس نے فوراً کہا، کیا آپ وہ جملہ لکھ رہے ہیں جو اس سے پہلے الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۶ صفحہ ۳۷) میں چھپ چکا ہے۔ مجھے نوجوان کی یادداشت پر حیرت ہوئی۔ اس نے کہا کہ ہم الرسالہ کو پڑھتے نہیں ہیں بلکہ اس کو کاغذ سے لے کر اپنے سینہ پر لکھتے ہیں۔ میں نے سابقہ الفاظ کاٹ کر اس کی جگہ یہ جملہ لکھ دیا: کائنات رزقِ خداوندی کا دسترخوان ہے۔ جس نے موجودہ دنیا میں خدا کا رزق پایا، وہی آخرت میں خدا کا رزق پائے گا۔ جو شخص دنیا میں خدا کے رزق سے محروم رہا وہ آخرت میں بھی خدا کے رزق سے محروم رہے گا۔

ایک شخص نے آٹو گراف کے لئے اپنی بک کھولی۔ اس میں یہ سوال لکھا ہوا تھا کہ "خوشی کیا ہے" اس کے جواب میں میں نے یہ الفاظ لکھ دئے: اس دنیا میں صرف وہ آدمی خوش رہ سکتا ہے جو ناخوشی کے حالات میں خوش رہنے کا فن جانتا ہو۔

ایک ہندو نوجوان نے اپنی بک کھول کر میرے سامنے رکھی اور کہا کہ اس میں کچھ نصیحت کی بات لکھ دیجئے۔ میں نے اس کی بک میں حسب ذیل انگریزی فقرہ لکھ دیا:

If you have a good excuse, don't use it.

سہارنپور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں فساد نہیں ہوتا۔ معمولی وقتی جھڑپیں تو ہوئی ہیں مگر باقاعدہ قسم کا فرقہ وارانہ فساد کبھی نہیں ہوا۔ میں نے اس کے اسباب جاننے کی کوشش کی تو یہ بات سامنے آئی کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان برابر آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو نیشنل انٹگریشن کا جو اجتماع ہوا، اس میں نہ صرف سب کو شریک کیا گیا بلکہ جن لوگوں کو انعامات تقسیم کئے گئے ان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے نام شامل تھے۔ حتی کہ "بدنام" قسم کی فرقہ پرست پارٹیوں کے افراد کو بھی فیاضی کے ساتھ تحسین و اعتراف سے نوازا گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مختلف قسم کی تقریبات اور اجتماعات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سربرآوردہ افراد بار بار آپس میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر قسم کے فساد کے لئے بلاشبہہ سب سے بڑا روک ہے۔ پچھلی نصف صدی کے دوران مسلم لیڈروں نے نمائشی دھوم دھڑکا میں جتنا وقت اور پیسہ برباد کیا ہے، اگر وہ اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپس کا میل ملاپ بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تو یقینی ہے کہ ہندستان میں فرقہ وارانہ جھگڑے پیدا ہونے سے پہلے ختم ہو چکے ہوتے۔ ممکن ہے کہ اس غیر نمائشی تدبیر کو اختیار کرنے کی صورت میں قائدین ملت کا اپنا قیادتی مینار کھڑا نہ ہوتا، مگر یہ یقینی ہے کہ خود ملت کے مسائل پورے طور پر حل ہو جاتے۔

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر کسی نہ کسی طور پر ایک ہی کام میں مشغول ہیں۔ حکمرانوں سے احتجاج و مطالبہ۔ اس قسم کی سیاست سراسر نادانی کی سیاست ہے۔ یہ عوامی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام اجتماعی فیصلے عوام کی سطح پر ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جدوجہد کا رخ عوام کے بجائے حکمرانوں کی طرف کرنا صرف زمانہ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، یہ اپنی جہالت کا اشتہار ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی قیادت۔

سہارنپور میں میرا قیام وہاں کے ڈاک بنگلہ میں تھا۔ "ڈاک بنگلہ" نو آبادیاتی دور کی اصطلاح ہے۔ برطانی دور میں ہندستان میں جگہ جگہ رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ یہ عام طور پر یک منزلہ

مکانات ہوتے تھے اور ان کے گرد وسیع خالی زمین ہوتی تھی۔ یہ مکانات نو آبادیاتی افسروں (Colonial officials) کے وقتی قیام میں، نیز گھوڑوں کے ذریعہ ڈاک کی روانگی میں درمیانی اسٹیشن کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ان کو اس زمانہ میں ڈاک بنگلہ کہا گیا۔ ڈاک بنگلہ کا لفظ بیک وقت دو چیزوں کی علامت ہے۔ سیاسی اعتبار سے نو آبادیاتی اقتدار، اور تمدنی اعتبار سے وہ دور جبکہ ڈاک صرف حیوانی طاقت کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی تھی۔

ڈاک بنگلہ کو، اس کے موجودہ استعمال کے لحاظ سے، اگر سرائے کہا جائے تو وہ زیادہ بامعنی ہوگا۔ مگر "وی آئی پی" حضرات جو اکثر ڈاک بنگلوں میں ٹھہرتے ہیں، وہ شاید اس کو پسند نہ کریں۔ کیونکہ "سرائے" کے لفظ نے استعمال کی بنا پر وہ کشش کھودی ہے جو "ڈاک بنگلہ" کے لفظ میں قدیم برطانی تاریخ کی بنا پر پائی جاتی ہے۔

۹ اپریل کی شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر نکل رہا تھا، ایک صاحب نے کہا: آپ نے تو اپنے اسلامی نقشہ میں بدر واحد کو ختم کر دیا ہے۔ ان کا یہ سوال طنزیہ لہجہ میں تھا۔ مزید یہ کہ وہ میری طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہے تھے جو میں نے خود نہ کہی ہو۔ میں نے سوچا کہ کیسے عجیب ہیں وہ نمازی جو اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے تو نمازی بن گئے، مگر اپنی سوچ اور اپنی بات میں وہ نمازی نہیں بنے۔

میں نے کہا کہ اس کو میں نے ختم نہیں کیا، البتہ آپ جیسے مسلمان ضرور اس کو ختم کر رہے ہیں۔ بدر و احد وقتی اشتعال کے تحت لڑ جانے کا نام نہیں۔ اس قسم کی لڑائی خودکشی کا عمل ہے۔ جب کہ "بدر واحد" تاریخ سازی کا عمل۔ حقیقت یہ ہے کہ بدر واحد ایک لمبے منصوبہ کے تحت پیش آنے والا مقدس واقعہ ہے ——— حق کی دعوت دینا۔ اس کو تمام آداب حکمت کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا۔ یہاں تک کہ وہ اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچ جائے۔ پھر ہجرت مکانی یا ہجرت عمل کے ذریعہ فریق ثانی کی جارحیت کے نشانہ سے ہٹ جانا۔ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو غیر جارح بنا لینا۔ ان سب مراحل کے بعد بھی اگر فریق ثانی چڑھائی کر کے حملہ آور ہو جائے تو پھر اس سے مقابلہ کرنا۔ یہ ہے وہ "بدر واحد" جس کے لئے "نصر من اللہ و فتح قریب" کی بشارت دی گئی ہے۔

موجودہ مسلمانوں نے "بدر واحد" کی تمام ابتدائی شرطوں کو عملاً منسوخ کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے حق میں وہ بدر واحد بھی منسوخ ہو چکا ہے جس میں خدا کے فرشتے ان کی مدد کے لئے اتریں اور انھیں

غلبہ وسربلندی کی خبریں سنائیں۔ جو کسان زراعت کی ابتدائی شرطوں کو پورا نہ کرے اس کے لئے فصل کے وقت فصل کاٹنا بھی مقدر نہیں۔ اسی طرح جو مسلمان "بدر واحد" کی ابتدائی شرطوں کو پورا نہ کریں ان کے لئے یہ مقدر نہیں کہ وہ "بدر واحد" کے مجاہدین میں لکھے جائیں اور بدر واحد کے ثمرات میں حصہ دار بنیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ "الرسالہ میرے دل کی آواز ہے"۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے الرسالہ کی ایجنسی لی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا، پھر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ الرسالہ آپ کے دل کی آواز ہے۔ دل تو ایسی چیز ہے کہ جو بات اس کی آواز بن جائے وہ دل کے اندر محدود نہیں رہ سکتی، وہ یقینی طور پر پھٹ کر نکلے گی۔ اور اسی کی ایک صورت الرسالہ کی ایجنسی ہے۔ ایجنسی دراصل صاحبِ ایجنسی کی شخصیت کی توسیع ہے۔ وہ دل کے جذبات کا کاغذی روپ اختیار کرکے باہر آنا ہے۔ ایک شخص جو حقیقی طور پر الرسالہ سے متاثر ہو، وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلانے کے عمل میں شریک نہ ہو جائے۔

انھوں نے کہا کہ میں ایجنسی لینا چاہتا ہوں، مگر میرے پاس پیسہ نہیں۔ میں نے کہا کہ الرسالہ دنیا کا واحد پرچہ ہے جس کی ایجنسی کسی نقصان کا خطرہ مول لئے بغیر لی جا سکتی ہے اور جس کو مفت پڑھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔

میں نے کہا کہ آپ پانچ پرچہ کی یا دس پرچہ کی ایجنسی لے لیں اور ایک پرچہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ پرچوں کو فروخت کرتے رہیں۔ آپ کو مفت میں ایک پرچہ ملتا رہے گا۔ اور اگر کچھ پرچے فروخت نہ ہو سکیں تو آپ کبھی بھی ان کو پوری قیمت پر واپس کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص ایجنسی نہ لینا چاہے تب بھی وہ مفت پڑھ سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک بار سالانہ چندہ (۴۸ روپئے) جمع کر دے اس کے بعد ہر ماہ کے پرچے صاف ستھری حالت میں اکٹھا کرتا رہے۔ یہاں تک کہ جب بارہ پرچے ہو جائیں تو وہ ان پرچوں کو دفتر میں واپس بھیج دے۔ اس کی بنیاد پر اس کو اگلے سال کے لئے رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ہر سال وہ ۱۲ پرچے واپس کرکے دوبارہ خرید ار بنتا ہے۔ اور آخر میں اگر چاہے تو پرچے واپس کرکے اپنی پوری رقم وصول کر لے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے فلاں "تنقید" دیکھی ہے جو آپ کے خلاف شائع ہوئی ہے۔

میں نے کہا کہ وہ تنقید نہیں، استہزا ہے۔ تنقید وہ ہے جس میں علمی تجزیہ ہو۔ اس میں کوئی علمی تجزیہ نہیں اس میں تو صرف لفظی مذاق اڑایا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ استہزا کرنا یا مذاق اڑانا ہمیشہ غیر سنجیدہ لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، ان سب کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ولقد استہزئ برسل من قبلک (انعام ۱۰) دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

یا حسرۃ علی العباد ما یاتیہم من رسول الا کانوا بہ یستہزءون (یٰس ۳۰)

پھر میں نے کہا کہ استہزا کا میدان اتنا وسیع ہے کہ کسی بھی شخص کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے، خواہ بذات خود وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ استہزا کرنے کے لئے زیر استہزا شخص کے اندر نقص کا ہونا ضروری نہیں ۔ استہزا کرنے والے کے اپنے اندر غیر سنجیدگی اور اللہ سے بے خوفی ہونا کافی ہے۔ اگر یہ سرمایہ کسی پاس ہو تو وہ پیغمبروں تک کا حتی کہ خدا کا بھی مذاق اڑا سکتا ہے ، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ملحدین کر رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں مگر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں آپ کا جو نقطۂ نظر ہے اس سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ مزید دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ "الرسالہ مسلمانوں کو بزدل بنا رہا ہے"۔

جن صاحب نے یہ بات کہی، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنے بیان کے مطابق الرسالہ برابر پڑھ رہے ہیں تو کیا آپ بزدل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں ، میں تو بزدل نہیں ہوا۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ کے اس علاقہ میں الرسالہ پڑھنے والے سیکڑوں افراد موجود ہیں۔ کیا آپ ان میں سے کچھ لوگوں کو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ، میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو برابر الرسالہ پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ ان بہت سے قارئین میں سے کسی ایک شخص کا نام بتا سکتے ہیں جو الرسالہ پڑھ کر بزدل ہو گیا ہو۔ میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اس سوال کے بعد ان کا پورا قلعہ دھڑام سے گر گیا ہو۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ الرسالہ کے بارے میں وہ جس واقعہ کی خبر مجھے دے رہے تھے ، اس سے وہ خود بھی متعین طور پر باخبر نہ تھے۔ میں نے بار بار ان سے پوچھا کہ آپ کسی ایک ایسے شخص کا نام بتائیں جو الرسالہ کو پڑھ کر بزدل ہو گیا ہو۔ مگر ایسا کوئی نام بتانے سے وہ عاجز رہے۔ انھوں نے نہ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور نہ الرسالہ کے کسی بزدل قاری

کا نام بتایا۔

پھر میں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی نہیں سکھاتا، الرسالہ حکمت سکھاتا ہے۔ بزدل دراصل وہ لوگ ہیں جو الرسالہ پر جھوٹی تنقیدیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ الرسالہ کی اصل بات کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس لئے بزدلانہ طور پر یہ کرتے ہیں کہ الرسالہ کی طرف ایک خلاف واقعہ بات منسوب کرتے ہیں اور پھر اس خلاف واقعہ بات پر تنقید کر کے خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے الرسالہ کی تردید کردی۔ حالاں کہ یہ خود اپنی بات کی تردید ہوتی ہے نہ کہ الرسالہ کی بات کی تردید۔

الرسالہ کے مخالف حضرات کا یہ حال ہے کہ وہ ہمارے لئے جائز تنقید کو بھی ناجائز بتاتے ہیں اور خود اپنے لئے ناجائز تشویہ کو جائز قرار دئے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک عجیب مثال اس دوران سامنے آئی۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشہور عربی مدرسہ میں آخری درجہ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے اس مضمون کا ذکر کیا جو "تشویہ حقائق" کے عنوان سے جنوری ۱۹۸۸ میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے عربی جریدہ کے جس مطبوعہ مضمون پر تنقید کی ہے وہ خود جریدہ کے ایڈیٹر کا نہیں تھا، وہ تو انھوں نے دوسرے پرچہ سے نقل کیا تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ نقل کفر کفر نباشد۔

میں نے کہا کہ آپ نے ادھوری بات کہی۔ نقل کفر اس وقت کفر نہیں ہے جب کہ وہ تردید کے لئے نقل کیا جائے۔ جو نقلِ کفر تصدیق کے ہم معنی ہو وہ یقیناً کفر ہے۔ انھوں نے کہا، مگر مذکورہ جریدہ نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ اس نے تو اپنی تصدیق شامل کئے بغیر اس کو جوں کا توں شائع کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ ایک غلط بات کو تردید کے بغیر شائع کرنا بالواسطہ طور پر اس کی تصدیق کرنا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں شریعت کی واضح ہدایت موجود ہے، اور جس معاملہ میں شریعت کی ہدایت موجود ہو اس میں ذاتی منطق لگانا ایمان کے منافی (الاحزاب ۳۶) ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح اذاعتِ خبر کو قرآن میں اتباع شیطان (النساء ۸۳) کہا گیا ہے۔ سورہ نساء کی اس آیت کے تحت حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:

اس میں ان لوگوں کے خلاف انکار ہے جو معاملات کی طرف بغیر اس کی تحقیق کئے ہوئے دوڑتے ہیں۔ وہ اس کو پھیلاتے ہیں اور اس کو نشر کرتے ہیں، حالاں کہ یہ ممکن ہے کہ وہ خبر خود صحیح نہ ہو۔ اور امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے

کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہرسنی ہوئی بات کو بیان کرنے لگے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹی بات ہے تو ایسا شخص دو کاذبوں میں سے ایک ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۳۰ - ۵۲۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک ایسی خبر کو بلا تحقیق پھیلانا شیطان کی پیروی کرنا ہے، اور اگر آدمی خبر کو جھوٹ جانتے ہوئے اسے پھیلائے تو وہ خود بھی اسی کذب بیانی کا مرتکب ہو رہا ہے جس کا ارتکاب اس شخص نے کیا تھا جس نے ابتداءً اس جھوٹ کو گھڑا تھا۔

۹ اپریل کو ایوارڈ اور انعامات کی تقسیم کی تقریب جن منچ (گاندھی پارک) میں ہوئی۔ وہاں ڈائس پر مجھ سے ملی ہوئی کرسی پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سادہ لباس اور سادہ انداز سے میں سمجھ نہ سکا کہ یہ "وی آئی پی" طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مسٹر چندرا ما ؤ لی (K. Chandramouli) ہیں جو سہارن پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ وہ مدراس کے رہنے والے ہیں اور ان کی مادری زبان تمل ہے۔ مگر وہ نہایت صاف اردو بول رہے تھے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ یوپی کیڈر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور لمبے عرصہ تک اردو کے علاقوں میں رہے ہیں۔

جب میری تقریر شروع ہوئی تو وہ اپنی کرسی پر نظر نہ آئے۔ میں نے سمجھا کہ شاید وہ کسی ضرورت سے واپس چلے گئے ہیں۔ مگر بعد کو ایک صاحب نے بتایا کہ جب آپ کی تقریر کا وقت آیا تو وہ ڈائس سے اتر کر نیچے آئے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے تاکہ تقریر کو اچھی طرح سن سکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں ڈی ایم سے متصل کرسی پر تھا۔ انھوں نے تقریر کے بارہ میں نہایت اچھے تاثر کا اظہار کیا اور اس سے پورا اتفاق کیا۔ مسٹر چندرا ما ؤلی کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر ڈاک سے روانہ کر دیا گیا ہے۔

مسٹر چندرا ماؤلی اور دوسرے ہندو صاحبان سے بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ یہ حضرات اگرچہ اردو رسم خط میں لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ نہیں سکتے مگر اردو زبان کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو الرسالہ کا پیغام پہنچانے کے لئے دو شکلیں جاری کی جانی چاہئیں۔ ایک یہ کہ الرسالہ کے ہمدرد اس قسم کے لوگوں کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سنائیں۔ دوسرا طریقہ کیسٹ کا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مرکز سے کیسٹ فراہم کئے جائیں۔ ہمارے احباب بطور خود ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ الرسالہ کے منتخب مضامین کو کیسٹ پر ریکارڈ کرلیں اور اس کے ذریعہ ان لوگوں تک الرسالہ کا پیغام پہنچائیں جو اردو کو پڑھ نہیں سکتے۔

مگرسن کر اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ اگر بڑے پیمانے پر شروع ہو جائے تو وہ انشاء اللہ ایک نئے انقلاب کے ہم معنی ہو گا۔

سہارن پور میں میری تقریر کا موضوع قومی ایکتا (National integration) تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں ہالینڈ کا وہ واقعہ بیان کیا جو راستہ میں پروفیسر اگوانی نے بتایا تھا۔ میں نے کہا کہ قومی ایکتا قائم کرنے کا طریقہ یہی رواداری ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں ملتی ہے۔ اسلام اس رواداری کو آخری حد تک قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ہالینڈ کے پروٹسٹنٹ پروفیسر نے کھانے کی میز پر ایک کیتھولک کو اپنی دعائیہ رسم ادا کرنے کی اجازت دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں یہاں تک گئے کہ آپ کے زمانہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اس دوران ان کی عبادت کا وقت آگیا تو آپ نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ مسجد نبوی میں اپنی عبادت کریں۔ چنانچہ انھوں نے مسجد نبوی کے صحن میں اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کے مراسم ادا کئے (سیرۃ ابن کثیر، رابع، صفحہ ۱۰۸)

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس وقت ہندستان کا مسئلہ نمبر ایک نیشنل انٹگریشن ہے۔ اس سے مجھے اصولاً اتفاق ہے۔ مگر اس کے لئے جو تدبیر بتائی جاتی ہے اس کو میں اصل مقصد کے لئے بالکل بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ نیشنل انٹگریشن حاصل کرنے کے لئے ہمیں کلچرل انٹگریشن لانا ہوگا۔ یعنی مختلف فرقوں کی تہذیبی شناخت کو ختم کر کے ایک مشترک کلچر بنایا جائے اور سب کو اسی ایک کلچر کا پابند کیا جائے۔ میں نے اپنی تقریر میں مختلف مثالیں دے کر بتایا کہ تہذیبی شناخت کسی بھی درجہ میں ایکتا اور یکجہتی میں مانع نہیں ہے۔ کسی ملک میں یکجہتی اس طرح آتی ہے کہ لوگوں کے اندر روادارانہ سوچ پیدا کی جائے۔ تہذیبی فرق کو مٹا کر یکجہتی پیدا نہیں کی جا سکتی۔

اس معاملہ میں اصل اہمیت ذہن کی ہے نہ کہ ظاہری آداب و رسوم کی۔ اور وہ ذہن یہ ہے کہ لوگوں کے اندر احترام انسانیت کا مزاج پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں فرق کی شکل کو نہیں مٹانا ہے بلکہ فرق کی سوچ کو مٹانا ہے۔ ظاہر والے فرق کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ دل والے فرق کو ختم کرنا ہے۔ ہمیں لوگوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ مذہب کے فرق کو اخلاق کا فرق نہ بنائیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک کیتھولک کیتھولک رہتے ہوئے پروٹسٹنٹ کی عزت کرے، اور اسی طرح ایک پروٹسٹنٹ، پروٹسٹنٹ رہتے ہوئے کیتھولک کی عزت کرے۔ یہی ایکتا اور یکجہتی پیدا کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا اس مقصد کو

حاصل کرنے کا کوئی اور ممکن طریقہ نہیں۔

یہ تقریر مزید اضافہ کے ساتھ مرتب کر لی گئی ہے۔ ان شاء اللہ اس کو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ زیر عنوان " بھارت کی تعمیر "

سہارن پور کے خطاب اور گفتگوؤں میں میں نے لوگوں کے سامنے یہی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اجتماع میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی موجود تھے۔ میری معلومات کے مطابق، ہر ایک نے اس نقطۂ نظر کو پسند کیا۔ تقریر کے بعد ڈاکٹر تشہیر احمد صاحب میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ کئی ہندوؤں نے مجھ کو یہ کہلا کر بھیجا ہے کہ میں آپ کو مبارک باد دوں اور یہ پیغام پہنچاؤں کہ آپ کی بات انھیں خوب سمجھ میں آئی۔ وہ اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں کہ ایکتا پیدا کرنے کے لئے ذہن کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ کلچرل پہچانوں کو مٹانے کی۔ مجھ سے براہ راست بھی کئی غیر مسلم صاحبان نے اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا۔

بعض فرقہ پرست ہندو لیڈر یہ کہتے ہیں کہ قومی ایکتا پیدا کرنے کا راز بھارتیہ کرن (انڈینائزیشن) ہے۔ یعنی تمام لوگوں کا زبان اور مذہبی شعار ایک ہو جائے، آپس میں شادی بیاہ ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مسلم قائدین سخت رد عمل کا اظہار کرتے ہیں اور " اسلام خطرہ میں " کی گھنٹی بجا کر زور و شور کے ساتھ تحفظ شریعت کی مہم چلانے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ غیر مفید بھی ہے اور اصل مسئلہ کو شدید تر کرنے والا بھی۔ میرے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قومی ایکتا بجائے خود ایک ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کلچرل شناختوں کو مٹانا نہیں بلکہ عدم رواداری کے ذہن کو مٹانا ہے۔ مسلم قائدین کے مذکورہ طریقہ میں آدمی صرف منفی رد عمل پیش کرنے والے کے روپ میں سامنے آتا ہے اور دوسری صورت میں وہ رہنمائی دینے والا بن جاتا ہے۔ پہلی صورت میں آدمی صرف دفاعی پوزیشن میں رہتا ہے، مگر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کے بعد وہ اقدامی پوزیشن میں آجاتا ہے۔ اور دفاعی پوزیشن کے مقابلہ میں اقدامی پوزیشن بلاشبہہ زیادہ طاقت ور ہے۔

موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں نے تقریباً ہر معاملہ میں ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے خدا کے دین کو عملاً تحفظ کا دین بنا دیا جب کہ باعتبار حقیقت وہ اقدام کا دین تھا۔

واپسی کا سفر شاملی کے راستہ سے ہوا۔ شاملی ایک تاریخی قصبہ ہے جو سہارن پور اور دہلی کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں علماء کی ایک جماعت نے شاملی میں انگریزی فوج پر حملہ کیا تھا۔

جس میں انھیں یک طرفہ طور پر شکست ہوئی۔

شاملی کے اس "جہاد" کی تفصیلات مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب سوانح قاسمی (مطبوعہ ۱۳۷۳ھ) میں درج کی ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاملی میں انگریزوں کی ایک گڑھی (چھوٹا قلعہ) تھا۔ تھانہ بھون کے علماء اور ان کے شاگردوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اور پھر دہلی کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرائیں۔" یہ اقدام درحقیقت پایہ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔" مولانا طیب کے الفاظ میں "سرفروشان دین اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لے کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کیا جس کا نصب العین دہلی تھا۔" اس فوج میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حافظ محمد ضامن، مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہ شریک تھے۔

یہ جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔ شاملی کے میدان میں ان کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا۔ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی جس کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے گڑھی کے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں۔ مجاہدین کا گروہ جو گڑھی کے باہر والے میدان میں تنکوں کی طرح پھیلا ہوا تھا ان پر انگریزی فوج نے بندوقوں سے مسلسل فائرنگ شروع کر دی۔ خود انگریزی فوج دیوار کے پیچھے محفوظ تھی۔ مگر مجاہدوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی جہاں وہ اپنے آپ کو گولی سے بچا سکیں۔ انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ مارنا شروع کیا جس سے سیکڑوں مجاہدین ہلاک ہو گئے۔ انگریزی فوج اپنے قلعہ میں محفوظ تھی اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے۔ انگریزوں کا حملہ پوری طرح کارگر اور کامیاب تھا جب کہ مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس یک طرفہ مار کی وجہ سے مجاہدین کا بے پناہ جانی ومالی نقصان ہوا۔

مجاہدین کا ایک دستہ تحصیل شاملی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس دستہ کے امیر الجیش مولانا حافظ محمد ضامن صاحب تھے۔ جب یہ لوگ گڑھی کے قریب پہنچے تو انگریزی فوج کے ایک سپاہی نے فصیل سے نشانہ لے کر ان پر گولی چلائی اور بقول مولانا طیب "گولی ناف پر پڑی" جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گئے۔ اس خبر یعنی حافظ ضامن صاحب کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی کمر توڑ دی اور وہ امید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی جس سے قلوب میں سرد مہری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ادھر

حافظ ضامن صاحب کی شہادت ہوئی اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دلّی (ظفر شاہ) گرفتار ہو گئے اور دلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا (جلد دوم، صفحہ ۱۷۰ - ۱۲۵)

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین جہاد کے نام پر جو اقدامات کر رہے ہیں، اگر یہی وہ چیز ہو جس کو شریعت میں اسلامی جہاد کہا گیا ہے تو زبان وادب کے ماہرین کو ایک نیا لغت تیار کرنا ہوگا جس میں مقدس اسلامی جہاد اور نادانی کی چھلانگ دونوں کو ہم معنی الفاظ کے طور پر درج کیا گیا ہو۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۸ کی صبح کو ۷ بجے ہم لوگ سہارنپور سے واپس روانہ ہوئے اور تین گھنٹہ کا سفر بذریعہ روڈ طے کرکے دوبارہ دہلی واپس آ گئے۔

ایک حدیث

عن ابی ھریرۃ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمرتُ بقریۃٍ تاکُلُ القُرٰی، یقولون یثربُ وھی المدینۃُ۔ (اخرجہ البخاری ومسلم والموطا)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے، وہ بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔

اس حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک اصولی بات کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اگرچہ ایک متعین صورت میں بیان کی جاتی ہیں۔ مگر اصلاً وہ باعتبار حقیقت مطلوب ہوتی ہیں نہ کہ باعتبار صورت۔ اس کی ایک مثال بنو قریظہ کے واقعہ میں ملتی ہے۔

غزوۂ احزاب کے بعد جب آپ نے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو آپ نے اس کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ تک پہونچنے سے پہلے ہرگز نہ پڑھے۔ (لا یُصَلِّیَنَّ احدٌ العصر الا فی بنی قریظۃ) لوگ مدینہ سے نکل کر روانہ ہوئے۔ مگر جب دیر ہونے لگی تو کچھ لوگوں نے راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی، اور کچھ لوگوں نے حکم کی لفظی تعمیل کرتے ہوئے بنو قریظہ کی بستی میں پہنچ کر نماز ادا کی۔

جن لوگوں نے راستہ میں نماز پڑھ لی۔ انھوں نے بظاہر حکم رسول کے خلاف کیا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے باز پرس نہیں کی، بلکہ دونوں کے عمل کی تصویب فرمائی۔ اس کی توجیہہ کرتے ہوئے محقق علماء نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے وقت آنے پر راستہ میں نماز پڑھ لی وہ غلطی پر نہ تھے۔ کیوں کہ انھوں نے سمجھا کہ آپ کی اصل مراد بنو قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کرنا ہے نہ کہ نماز میں دیر کرنا (لانھم فھموا انّ المراد انما ھو تعجیل السیر الی بنی قریظۃ لا تاخیر الصلوٰۃ، السیرۃ النبویہ لابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۲۲۷)

اسلامی طریقہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کی ایک تدبیر اگر کارگر نہ ہو رہی ہو تو اس کو بدل کر دوسری تدبیر کے ذریعہ مقصد تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس اصول کے تحت کبھی مقام عمل کو بدلا جاتا ہے، جیسے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔ اور کبھی میدان عمل کو بدلا جاتا ہے، جیسے حدیبیہ کے معاہدہ کے ذریعہ جنگ کے میدان سے ہٹ کر دعوت کے میدان میں سرگرم ہونا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۴۱

۱۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے حلقہ کی جانب سے بار بار یہ تقاضا سامنے آرہا ہے کہ اسلامی مرکز کا کل ہند اجتماع کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اطلاع دی جاتی ہے کہ انشاء اللہ ۱۹۸۸ کے آخر میں اسلامی مرکز کا کل ہند اجتماع ہوگا۔ مقام اور تاریخ کا قطعی اعلان بعد کو کیا جائے گا۔

۲۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے تحت لندن میں کتابوں کی بین اقوامی نمائش (International Book Fair) ہوئی۔ یہ نمائش ۲۸ — ۳۰ مارچ ۱۹۸۸ کو تھی۔ اس نمائش میں ہندستان کی منتخب مطبوعات رکھی گئی تھیں۔ ان منتخب کتابوں میں اسلامی مرکز کی کتاب مذہب اور جدید چیلنج بھی شامل تھی۔ اس کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ کی رپورٹ میں صفحہ ۴۵ پر کیا گیا ہے —— اس نمائش میں ہندی، بنگالی، انگریزی، پنجابی، اردو کتابیں رکھی گئی تھیں۔

۳۔ سہارن پور میں ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں صدر اسلامی مرکز نے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا: "قومی ایکتا اور انسانی ترقی میں مذہب کا رول" اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو ایک خصوصی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی تفصیل انشاء اللہ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۷ اپریل ۱۹۸۸ کی شام کو ایک عمومی اجتماع ہوا۔ پروفیسر ایم۔ ایس اگوانی (وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی جس کا عنوان یہ تھا: "اسلام دور جدید کا خالق"۔ تعلیم یافتہ اصحاب کا بڑا طبقہ شریک ہوا۔ شرکاء اجتماع میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب، جناب بدرالدین طیب جی اور دوسرے معزز حضرات شامل تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔ لوگوں نے تقریر کو پسند کیا اور کہا کہ اس قسم کی تقریر کا سلسلہ ہر مہینہ جاری رہنا چاہیے۔ تجویز ہے کہ ہر "سکنڈ سٹرڈے" کو بعد نماز مغرب یہ سلسلۂ تقریر شروع کیا جائے۔

۵۔ اسلامی مرکز کا ایک مستقل شعبہ کتابوں کی اشاعت ہے "عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر"

کے لیے اب اسلامی مرکز ایک معروف نام بن چکا ہے۔ اس کے تحت چھپنے والی تازہ کتابیں حسب ذیل ہیں : مذہب اور سائنس نامی کتاب کا انگریزی ترجمہ، خاتونِ اسلام، نیا ایڈیشن سو صفحات کے اضافہ کے ساتھ، میوات کا سفر نامہ، بھارت کی تعمیر۔

۶۔ تذکیر القرآن پورے قرآن کی تفسیر دو جلدوں میں ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد ہم کو ایسے خطوط مل رہے ہیں جن میں تذکیر القرآن کے مطالعہ کے شدید شوق کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ لوگ لکھتے ہیں کہ ہم اپنی ناداری کی وجہ سے تذکیر القرآن کو قیمت دے کر خرید نہیں سکتے۔ صاحب استطاعت حضرات سے ہماری اپیل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی طرف سے قیمت ادا کر کے انھیں تذکیر القرآن فراہم کرنے میں تعاون فرمائیں۔ تعاون کرنے والے اگر چاہیں گے تو انھیں مرسل الیہ کا نام و پتہ روانہ کر دیا جائے گا۔

۷۔ عرصہ سے یہ تقاضا کیا جاتا رہا ہے کہ الرسالہ کا ہندی ایڈیشن نکالا جائے۔ اب ایک عملی تجویز یہ سامنے آئی ہے کہ ہندی ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ موجودہ الرسالہ ہی کو ہندی رسمِ خط (لیپی) میں منتقل کر کے ہر ماہ اسے شائع کیا جائے۔ یعنی زبان اُردو الرسالہ ہی کی ہو۔ صرف رسمِ خط بدل دیا جائے۔ اس سلسلہ میں الرسالہ مشن کے ہمدرد حضرات اپنی رائے دیں۔ نیز یہ بھی لکھیں کہ مذکورہ صورت میں وہ بطور ایجنسی ہر ماہ کتنی تعداد منگانے کی ذمہ داری لے سکیں گے۔

۸۔ جموں وکشمیر کا ایک ادارہ (مسلم انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن) جس کے تحت کئی اسکول چل رہے ہیں۔ اس نے اپنے پرائیویٹ اسکولوں کے نصاب میں اسلامی مرکز کی کچھ کتابیں داخلِ نصاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں باغ جنت، نارِ جہنم، حیاتِ طیبہ اور تذکیر القرآن کا تیسواں پارہ شامل ہے۔

۹۔ مشاہدات اور رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ کی بات تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔ گفتگو کرنے والے اپنی گفتگو میں اور تقریر کرنے والے اپنی تقریر میں اس کو دہرانے لگے ہیں۔ بہت سے اخبار اور رسالے الرسالہ کی باتوں کو برابر نقل کر رہے ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جو نام اور حوالہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر وہ ہیں جو نام اور حوالہ کے بغیر اس

کو اپنی بات کے طور پر شائع کرتے ہیں۔ ان پھیلانے والوں میں ہمارے مخالفین ہیں۔ الرسالہ کا پیغام الرسالہ کے ذریعہ جتنا پھیل رہا ہے، اس سے زیادہ دوسر اس کو پھیلا رہے ہیں۔ کچھ احباب اگر براہ راست طور پر الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں تو دوسرے بہت سے وہ لوگ ہیں جو بالواسطہ طور پر الرسالہ کی ایجنسی کا کام کر رہے ہیں۔

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط مورخہ (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: دو تین سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ میں نے جب اسے پہلی بار پڑھا تو دیوانہ وار کئی بار پڑھا اور اسی وقت ٹھان لیا کہ میں الرسالہ کو اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔ اس میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ اگر کم ہمتی اور بے دلی اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہوں تو عجب نہیں کہ صاحب مطالعہ تجدید زندگی کرے۔ جس کی کشتی بھنور میں ہو اس کے لیے الرسالہ ناخدا سے کم نہیں۔ نوجوانوں کے لیے اس کا مطالعہ مشعل راہ ہے۔ آدمی اس کو دوبارہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور ہر مرتبہ اس کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ (محمد عبد المجید، بھینسا)

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ ہر دین سے لگاؤ رکھنے والے کی ربانی اور روحانی ضرورت بن گیا ہے۔ اس کا ہر صفحہ قرآن و حدیث سے اخذ شدہ ہوتا ہے۔ آپ پر جو تنقید کبھی کبھی نظر سے گزرتی ہے وہ صرف تنقید برائے نفسانیت ہوتی ہے یا حقیقت سے انکار کی احمقانہ جرأت۔ میں آپ کے پیغمبرانہ مشن پر اپنے آپ کو لگانے پر رضامند ہوں۔ کچھ حضرات کے نام الرسالہ جاری کروانے کا ارادہ ہے۔ یہاں امام صاحب الرسالہ سے پوری طرح متفق ہیں۔ ہر جمعہ کو تقریر کرتے ہیں۔ الرسالہ سے ان کی تقریروں میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے جو پہلے نہ تھا (مشتاق احمد، شیو گنج)

۱۲۔ الرسالہ خدا کے فضل سے بے شمار لوگوں کے لیے نئی زندگی کا باعث بن رہا ہے۔ اس کا اندازہ بار بار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ ۱۶ مئی ۱۹۸۸ کو ایک صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ بعض اسباب کے نتیجہ میں میں سخت مایوسی کا شکار تھا۔ عین اس وقت الرسالہ اپریل ۱۹۸۸ ملا۔ اس کے صفحہ ۲ پر "چیلنج نہ کہ ظلم" کو پڑھا تو آنکھ کھل گئی اور اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر نئی طاقت آگئی ہے۔

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ
جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

کتاب	
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

کتاب	
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

Title	
God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4